شیخ محمد عبدہ کی تفسیری خدمات

صفدر سلطان اصلاحی

شیخ محمد عبدہ ۱۲۶۵ھ۔۱۸۴۹ء میں مصر میں ضلع "البحیرۃ" کے ایک گاؤں "محلہ نصر" میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد عبدہ بن حسن خیر اللہ گاؤں کے انتہائی باوقار اور بااثر لوگوں میں سے تھے۔ ہمدردی و غمگساری، جود و سخا اور خدمت خلق میں ان کا ایک منفرد مقام تھا۔ وہ حق کی حمایت، عہد کی پاسداری اور مخالفتوں کے بالمقابل صبر و ثبات کی صفات سے بھی متصف تھے۔ ان کی والدہ "سیدہ جنینہ" بھی ایک نیک اور ذی حیثیت خاتون تھیں۔ فقیروں اور محتاجوں کی حمایت اور پریشان حال لوگوں کی مشکلات کا ازالہ ان کا امتیازی وصف تھا۔ شیخ محمد عبدہ نے اپنے والدین کی مذکورہ خوبیاں وراثت میں پائی تھیں (۱)

ان کی ابتدائی تعلیم کا اہتمام گاؤں کے مکتب کے بجائے گھر پر ہوا۔ والد صاحب نے ان کے لئے ایک استاد کی خدمات حاصل کرلی تھیں۔ جب وہ کچھ بڑے ہوئے تو انہیں گاؤں کے مکتب میں بھیج دیا گیا جہاں ایک حافظ سے انہوں نے قرآن پڑھا پھر دو سال میں اسے حفظ کیا (۲)۔ ۱۲۷۹ھ۔۱۸۶۲ء میں قرآن پاک کی تجوید اور دیگر علوم کی تحصیل کے لئے وہ شہر طنطا کی مسجد "جامع احمدی" میں قائم مدرسہ میں داخل ہوئے۔ قرآن مجید کی تجوید اور اس کے اصول و آداب سے انہوں نے جلد ہی واقفیت حاصل کرلی۔ بعض دوسرے علوم خاص طور سے نحو و صرف اور فقہ کی تعلیم ان کے لئے مشکل ثابت ہوئی کیونکہ اساتذہ قدیم طرز تدریس کے عادی تھے اور فقہی و نحوی مسائل کو اپنے مخصوص طریقۂ تعلیم کی وجہ سے اور زیادہ پیچیدہ بنادیتے تھے۔ نتیجۃً ڈیڑھ سال کے ناکام تجربہ کے بعد وہ جامع احمدی سے دل برداشتہ ہو کر گھر واپس چلے گئے اور کھیتی باڑی کے کاموں میں حصہ لینے لگے۔ تعلیم سے بے رغبتی اور عدم دلچسپی کو دیکھ کر ان کے والدین نے ۱۲۸۲ھ۔۱۸۶۵ء میں ان کی شادی کردی۔ (۳)

شادی کے بعد ان کے والد نے ایک بار پھر ان پر تعلیم کے لئے دباؤ ڈالا اور انہیں زبردستی "طنطا" بھیج دیا۔ وہ گھر سے اسکول کیلئے روانہ ہوئے لیکن تعلیم کے لئے آمادگی نہ ہونے کی وجہ سے راستے میں واقع ایک گاؤں "کنیسہ اورین" میں رک گئے۔ یہاں ان کے والد کا ننہال تھا اس لئے گاؤں کے اکثر لوگ رشتہ دار ہوتے تھے۔ اتفاق سے اس گاؤں میں ان کی ملاقات شیخ درویش خضر سے ہوگئی جو ان کے والد کے ماموں ہوتے تھے۔ وہ حافظ قرآن اور محدث تھے اور تصوف کے سلسلہ شاذلیہ سے منسلک تھے۔ انہوں نے لیبیا اور طرابلس کا سفر کیا تھا اور مشہور صوفی بزرگ سید محمد مدنی سے کسب فیض کیا تھا۔ ان کی صحبت نے شیخ محمد عبدہ کی زندگی پر بڑا خوشگوار اثر ڈالا (۴)، اس کے نتیجہ میں ان کے اندر دین سے شغف، تعلیم سے محبت اور بدعات و خرافات سے اجتناب کا داعیہ پیدا ہوا۔ وہ خود لکھتے ہیں:

تفرقت عنی جمیع الھموم ولم یبق الا ھم واحد وھو ان اکون کامل المعرفة ،کامل ادب النفس ولم اجد اماما یرشدنی الی ما وجھت الیه نفسی الا ذلك الشیخ الذی اخرجنی فی بضعة ایام من سجن الجھل الی فضاء المعرفة و من قیود التقلید الی اطلاق التوحید. ھٰذا الشیخ ھو مفتاح سعادتی ان کانت لی سعادة فی ھذہ الحیاة الدنیا.(۵)

میری تمام الجھنیں جاتی رہیں بس ایک فکر باقی رہ گئی کہ میں علم و معرفت اور تہذیب و سلیقہ میں کامل ہو جاؤں لیکن مجھے کوئی امام (رہنما) نہیں ملا جو میرے عزائم میں میری رہنمائی کرتا سوائے اس شیخ کے جس نے مجھے چند دنوں میں جہالت اور تقلید کے قید و بند سے آزاد کر کے معرفت اور توحید خالص کی کشادہ فضا میں داخل کر دیا تھا اگر مجھے دنیا میں سعادت کا کوئی حصہ نصیب ہوا ہے تو اس کی کلید یہی شیخ ہیں۔

"کنیسہ اورین" میں پندرہ دن کے قیام کے بعد وہ تکمیل تعلیم کیلئے طنطا روانہ ہوگئے، اس وقت تعلیمی سال اختتام کے قریب تھا لیکن پیہم جد و جہد اور مکمل انہماک کی وجہ سے انہوں نے بہت جلد نصاب تعلیم کی خواندگی کر لی اور ممتاز طالب علموں میں شمار کئے جانے

لگے، امتحان سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے عالمیت کی سند کے حصول کے لئے ۱۲۸۲ھ۔ ۱۸۶۶ء میں جامعہ ازہر میں داخلہ لیا(۶)، اس وقت جامعہ ازھر کا نظام تعلیم نہایت فرسودہ تھا۔ اساتذہ کی ذمہ داریاں متعین نہیں تھیں۔ طلبہ پر تعلیم کیلئے کوئی دباؤ نہیں تھا۔ ان کی رہائش اور طعام کا انتظام بھی حد درجہ ناقص تھا۔ نظام کے نام سے اگر وہاں کوئی چیز تھی تو صرف یہ کہ طلبہ کا نام وہاں داخلہ کے وقت رجسٹر میں درج کر لیا جاتا تھا۔ اس کے بعد وہ کچھ متعینہ مدت گذار کر عالمیت کے امتحان کیلئے مستحق قرار پاتا تھا۔ شیخ محمد عبدہ نے بھی وہاں کل بارہ سال قیام کیا (۷)، ان کی خوش قسمتی تھی کہ وہ چھٹیوں میں اپنے وطن آجاتے تھے اور اپنے پیرو مرشد شیخ درویش خضر کو پورے سال کی تعلیمی پیش رفت سے آگاہ کرتے تھے۔ شیخ ان کو مناسب مشورے دیتے تھے اگر کسی علم یا فن کے بارے میں ان کی معلومات ناقص ہوتیں تو وہ ان کی تلافی کی شکلوں کی نشاندہی کرتے تھے، جامعہ ازہر کے قدامت پرست علماء کی اکثریت علوم عقلیہ کی تدریس کو دینی مصالح کے منافی سمجھتی تھی۔ شیخ درویش نے انہیں بتایا کہ علم کے حصول میں کسی تعصب سے کام نہیں لینا چاہیے اور ہر طرح کا علم پورے ذوق و شوق سے حاصل کرنا چاہیے (۸)۔

جامعہ ازہر میں قیام کے دوران شیخ محمد عبدہ کو اپنے استاذ شیخ حسن طویل سے خصوصی فائدہ پہنچا۔ وہ ازہری علماء میں اپنی کشادہ ذہنی، حریت فکر اور علوم عقلیہ میں مہارت کی وجہ سے منفرد مقام رکھتے تھے۔ عبدہ نے ان سے ریاضی، فلسفہ اور سیاسیات کا درس لیا اور وہ انہیں کی وساطت سے جامعہ ازھر میں قائم حلقہ تصوف سے منسلک ہوئے۔ یہ حلقہ مشہور ازھری صوفی حسن رضوان کے تلامذہ اور مریدین پر مشتمل تھا۔ (۹)

محمد عبدہ انتہائی بیدار اور تیز ذہن و دماغ کے مالک تھے۔ دوران تعلیم ان کے ذہن میں جدید و قدیم علوم سے متعلق ہزاروں سوالات ابھرتے۔ وہ ان علوم کے درمیان توافق کے حامی تھے، اسی طرح سماجیات، اقتصادیات اور سیاسیات سے متعلق جدید مسائل سے واقفیت اور ان کی مدد سے مصر اور پورے عالم اسلام کی اصلاح بھی ان کی دلی آرزو تھی۔ انہیں اس بات کا شدید قلق تھا کہ ازہری علماء ان کی علمی تشنگی اور فکری احتیاج کی تکمیل سے قاصر تھے۔ شیخ درویش خضر اور شیخ حسن طویل نے ان کو فکر و عمل کی ایک راہ ضرور دکھائی تھی لیکن یہ دونوں حضرات بھی ان کی اعلیٰ ذہنی و فکری استعداد کے مطابق ان کی رہنمائی نہیں کر سکے۔

اس صورتحال میں شیخ جمال الدین افغانی سے ان کا تعارف اور تلمذ ان کے لے ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئی، افغانی ۱۲۸۸ھ۔۱۸۷۱ء میں مصر آئے۔(۱۰) وہ مصر میں ایسے علماء کی ایک جماعت تیار کرنا چاہتے تھے جو ان کے افکار و خیالات کی ترجمان بن سکے۔ محمد عبدہ نے ان سے بھرپور استفادہ کیا۔ ان سے عربی اور اسلامی علوم سے متعلق بہت سی اہم کتابوں کے علاوہ فلسفہ، تاریخ، سیاست اور معاشرت پر منتخب اور مشہور یورپی علماء کی تصانیف بھی پڑھیں، ان کتابوں سے وہ علم و فکر کے نئے انداز اور زاویوں سے واقف ہوئے اور انہیں علمی طور سے ایک ایسی توانائی اور اعتماد و استحکام حاصل ہوا جو اب تک کے اساتذہ اور کتابوں سے حاصل نہیں ہو سکا تھا۔ اس تعلق و تلمذ سے انہیں سب سے بڑا فائدہ یہ پہنچا کہ حریت فکر اور اصلاح معاشرہ کا جو تصور ان کے استاذ اول شیخ درویش خضر نے پیش کیا تھا، افغانی نے اسے جلا بخشا اور اس کے علمی اظہار کے وسائل سے روشناس کیا۔ اس کے نتیجہ میں انہیں یہ یقین و شعور حاصل ہوا کہ ان کے اصلاحی تصورات محض فلسفیانہ نظریات نہیں تھے بلکہ قابل عمل پروگرام کی حیثیت رکھتے تھے۔(۱۱)

۱۲۹۴ھ۔۱۸۷۷ء میں، ۲۸ سال کی عمر میں شیخ محمد عبدہ کو جامعہ ازہر کی طرف سے عالمیت کی سند عطا کی گئی حالانکہ جمال الدین افغانی سے تعلق اور بعض دوسرے اسباب کی بنا پر ازہری علماء ان سے بہت زیادہ ناراض تھے۔ سند عالمیت کے حصول کے بعد اب وہ جامعہ ازہر میں درس و تدریس کے لئے اہل اور مستحق ہو چکے تھے۔ ان کے اصلاحی پروگرام کے نفاذ کے لئے بھی یہ ایک مناسب شکل تھی۔ چنانچہ انہوں نے جامعہ ازہر میں منطق و فلسفہ کا درس دینا شروع کیا۔ اس میں طلبہ بڑی تعداد میں شریک ہوتے تھے۔ اسی دوران قاہرہ کے مشہور ڈگری کالج دار العلوم میں تاریخ کے استاد کی حیثیت سے ان کا تقرر ہو گیا، انہوں نے اس مضمون کی تدریس کے لئے روایتی انداز کی کسی تاریخی کتاب کے بجائے "مقدمۃ ابن خلدون" کا انتخاب کیا۔ وہ اپنی فکر کو عام کرنے کی غرض سے اپنے گھر پر منتخب طلبہ کو الگ سے پڑھایا کرتے تھے۔ اسی مقصد کے تحت انہوں نے "مدرسۃ الادارۃ و الألسن الخدیویۃ" میں بھی ایک مضمون کی تدریس کا ذمہ لے لیا۔(۱۲)

۱۸۷۹ء میں جمال الدین افغانی کو انگریزوں کی ایماء پر مصر سے چلے جانے کا حکم دیا گیا۔

انگریز جمال الدین افغانی کے سخت مخالف تھے کیونکہ اتحاد امت، آزادی رائے اور جمہوریت پر مبنی ان کے خیالات کی زد براہ راست انگریزوں کے مفادات پر پڑتی تھی۔ افغانی سے تعلق خاطر کی بنیاد پر محمد عبدہ بھی حکومت کے عتاب کے شکار ہوئے۔ انہیں ملازمت سے برخاست کر دیا گیا اور انہیں اپنے گاؤں جانے اور وہیں قیام کرنے کا حکم دیا گیا۔۔ جس وقت افغانی مصر چھوڑ کر جا رہے تھے انہوں نے اپنے سوگوار اور ملول شاگردوں کو مخاطب کر کے فرمایا تھا۔

ترکت لکم الشیخ محمدعبدہ و کفی به لمصر عالما. (۱۳)

۱۲۹۷ھ۔ ۱۸۸۰ء میں مصری وزیر اعظم ریاض پاشا کی کوششوں سے ان کی نقل و حرکت پر عائد پابندی ختم کر دی گئی اور وہ قاہرہ واپس چلے آئے جہاں بہت جلد انہیں سرکاری گزٹ " الوقائع المصریة" میں ملازمت مل گئی۔ بعد میں ترقی دے کر انہیں اس گزٹ کا ایڈیٹر بنا دیا گیا، (۱۴) انہوں نے اس موقع کو اپنے خیالات کی اشاعت کے لئے بہت مناسب تصور کیا چنانچہ انتہائی موثر اور حکیمانہ انداز میں اپنی دعوت اہل مصر کے سامنے پیش کی۔ ان کی اصل توجہ آزادی رائے، عدل و انصاف اور شورائیت کے تصورات کو عام کرنے پر مرکوز تھی۔ وہ قوم کی ترقی کیلئے تعلیم کو ایک اہم ذریعہ سمجھتے تھے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ سب سے پہلے دین اور اس کی حقیقی تعلیمات سے عوام کو متعارف کرانا چاہیے اور ان کے مطابق انہیں زندگی بسر کرنے پر آمادہ کرنا چاہیے۔ اسکے بعد ہی وہ اصلاح کے ہمہ گیر مفہوم سے آشنا ہوں گے۔ اور اصلاحات کے نفاذ میں اپنا تعاون پیش کر سکیں گے۔ (۱۵)

۱۸۸۲ء میں جب کہ وہ "الوقائع المصریة" کے ایڈیٹر تھے، عرابی انقلاب کے شعلے پورے مصر میں بھڑک اٹھے، شیخ محمد عبدہ اس بغاوت کے خلاف تھے۔ کیونکہ تبدیلی اور اصلاح کا عمل ان کے نزدیک تبلیغ و تلقین اور افہام و تفہیم کے ذریعہ ہی کامیاب ہو سکتا تھا۔ لیکن آزادی اور شورائیت سے متعلق ان کے خیالات ہر خاص و عام پر واضح تھے۔ اس لئے اس بغاوت کی ناکامی کے بعد اس میں ملوث دیگر حضرات کے ساتھ انہیں بھی تین سال کے لیئے جلاوطن کر دیا گیا، چنانچہ وہ سب سے پہلے شام پہنچے جہاں ایک سال تک قیام کیا اس کے بعد ۱۸۸۴ء میں ان کے استاد جمال الدین افغانی نے انہیں پیرس بلا لیا۔ وہاں کل دس ماہ تک قیام کیا۔ اس دوران انہوں نے یورپ کے بعض ممالک کا سفر کیا اور کئی دوسرے مفید کام

انجام دئے لیکن ان کا سب سے اہم کارنامہ مجلّہ " العروۃ الوثقیٰ " کا اجراء تھا(۱۶)۔اس کا خاکہ جمال الدین افغانی نے تیار کیا تھا اور وہی اس کے چیف ایڈیٹر تھے۔ لیکن محمد عبدہ کی شرکت اور معاونت کے بغیر اس کی اشاعت ممکن نہیں تھی۔افغانی اور عبدہ نے اپنے مقالات کے ذریعہ عالم اسلام کو متحد کرنے ،اہل مشرق کو استعماری طاقتوں کے عزائم سے آگاہ کرنے اور انہیں غلامی کی لعنت سے آزادی حاصل کرنے کے لئے شوق ورغبت دلائی(۱۷)۔ان مقالات کی وجہ سے " العروۃ الوثقیٰ " کی مقبولیت بہت تیزی سے بڑھتی جارہی تھی۔ چنانچہ انگریزوں نے منصوبہ بند طریقے سے اس کی اشاعت میں طرح طرح کی مشکلات پیدا کیں، چاروناچار اسے آٹھ ماہ کے اندر اٹھارہ شماروں کی اشاعت کے بعد ۱۸۸۴ء میں بند کرنا پڑا۔(۱۸)

" العروۃ الوثقیٰ " کی اشاعت رک جانے کے بعد جمال الدین افغانی ایران چلے گئے اور محمد عبدہ نے بیروت کا قصد کیا یہاں انہوں نے سیاست اور حکومت کے مسائل کے بجائے تصنیف و تالیف اور درس و تدریس کو ترجیح دی۔ چنانچہ نہج البلاغۃ اور مقامات بدیع الزماں ہمدانی کی شرح لکھی، جمال الدین افغانی کے رسالہ " الرد علی الدھرین " کا فارسی سے عربی میں ترجمہ کیا، منطق سے متعلق ایک کتاب " شرح البصائر النصیریۃ " اور " رسالۃ التوحید " بھی اسی دور جلاوطنی کی یادگار ہیں۔ تصنیف و تالیف کے ساتھ ساتھ وہ درس و تبلیغ کا کام بھی کرتے رہے چنانچہ بیروت کی ایک مسجد میں ہر ہفتہ درس قرآن دیتے تھے۔۱۸۸۵ء میں انہیں مدرسہ سلطانیہ میں عربی زبان اور دینیات کی تعلیم کے لئے مدعو کیا گیا۔انہوں نے اس دعوت کو بخوشی قبول کرلیا۔اس مدرسہ میں انہوں نے روایتی درس و تدریس سے آگے بڑھ کر نصاب تعلیم میں بعض بنیادی تبدیلیوں کی نشاندہی کی(۱۹)۔

شیخ محمد عبدہ کو کل تین سال کے لئے جلاوطن کیا گیا تھا۔ لیکن انہوں نے عملاً چھ سال تک جلاوطنی کی زندگی گزاری۔اس کی وجہ مصر کے حکمراں توفیق پاشا کی ان سے ناراضگی اور مخالفت تھی لیکن وزیر اعظم ریاض پاشا کی کوشش ایک بار پھر کام آئی اور انہیں وطن واپسی کی اجازت مل گئی۔ وہ ۱۸۸۸ء میں مصر واپس آئے۔(۲۰) لیکن اس دفعہ انہیں تدریس کی ذمہ داری نہیں دی گئی بلکہ ضلعی عدالت کا قاضی بنادیا گیا کیونکہ حکومت کو امید تھی کہ وہ قضا کے معاملات میں الجھ کر اپنا اصلاحی پروگرام جاری نہیں رکھ سکیں گے ، کچھ عرصہ بعد انہیں محکمۃ

الاستیناف (Court of appeal) کا رکن نامزد کیا گیا۔(۲۱) قضاۃ ہونے کے بعد انہیں فرانسیسی زبان سیکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی کیونکہ مصری قاضی اپنے فیصلوں میں فرانسیسی قوانین کا بکثرت حوالہ دیتے تھے۔اس وقت ان کی عمر چالیس سال کی تھی لیکن انہوں نے بہت کم عرصہ میں فرانسیسی زبان بقدر ضرورت سیکھ لی۔بعد میں ان کے مقالات اور تصانیف میں فرانسیسی زبان سے استفادہ کی مقدار بہت زیادہ بڑھ گئی،انہوں نے فرانسیسی مفکر سپینسر کی کتاب کا"التربیۃ" کے نام سے عربی میں ترجمہ بھی کیا(۲۲)

۱۸۹۲ء میں خدیو توفیق کا انتقال ہو گیا اور اس کی جگہ خدیو عباس مصر کا بادشاہ ہوا۔وہ ایک بہادر اور باعزم نوجوان تھا اور مصر کی ترقی کے لئے متفکر تھا۔شیخ محمد عبدہ اور ان کے رفقاء کو اس سے کافی امیدیں بندھ گئیں تھیں۔وہ اس سے قریب ہوئے اور اسکے سامنے ازہر،اوقاف اور شرعی عدالتوں کی اصلاح سے متعلق تجاویز رکھیں،خدیو نے ازہر سے متعلق ان کی اصلاحی تجاویز سے اتفاق کیا اور پہلی دفعہ جامعہ ازہر کی مجلس انتظامی تشکیل دی اور محمد عبدہ کو اس مجلس کا ایک ممبر بنایا۔انہوں نے ازہر کی اصلاح کی بے انتہا کوشش کی لیکن وہاں کے روایت پسند علماء کی مخالفت کے باعث ان کو نمایاں کامیابی نہیں مل سکی۔(۲۳)

۱۸۹۹ء کے اوائل میں حکومت مصر نے انہیں مصر کا مفتی اعظم مقرر کیا۔اس سے دونوں کے وقار میں اضافہ ہوا۔(۲۴) یہاں وہ فتوی نویسی پر اکتفا نہیں کر سکتے تھے بلکہ انہوں نے اپنے اثرات کو استعمال کرے معاشرت،سیاست،زبان اور تعلیم سے متعلق اپنے اصلاحی مشن کو آگے بڑھایا۔چونکہ وہ مزاجا تقلید اور اندھی پیروی کے مخالف تھے اس لئے ان کا یہ رنگ ان کے فتاوئ میں صاف طور سے نظر آتا ہے۔ان کی کوشش تھی کہ وہ اسلام اور جدید عصری تقاضوں کی روشنی میں عوام کی مشکلات کا حل پیش کریں۔(۲۵)

قضا اور افتاء جیسی اہم ذمہ داریوں پر ہوتے ہوئے بھی وہ ملک اور معاشرہ کی فلاح و بہبود کے لئے دوسری سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے۔۱۸۹۹ء میں انہیں "مجلس شوری القوانین" کا ممبر بنایا گیا۔اس کے بعد "مجلس الاوقاف الاعلی" کی ممبر شپ بھی انہیں عطا کی گئی۔ان دونوں مجالس میں انہوں نے برابر شرکت کی اور ملک اور باشندگان ملک کے حق میں مناسب مشورے دئے،سرکاری اداروں کے علاوہ خالصۃً عوامی اداروں میں بھی وہ بہت اہم

کردار ادا کرتے تھے۔ "الجمعیة الاسلامیة الخیریة" کے اولین موسسین کی فہرست میں ان کا نام بھی شامل تھا۔ اس انجمن کا مقصد غریب بچوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام تھا اور اس میں انجمن کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ اس کے علاوہ انہوں نے "جمعیة احیاء الکتب العربیة القدیمة" کے نام سے ایک ادارہ بھی قائم کیا تھا۔ اس کا مقصد قدیم عربی کتابوں کی نشر و اشاعت تھا۔ (۲۶)۔ انہوں نے عدالتی نظام کی اصلاح کا بھی بیڑہ اٹھایا۔ وہ ججوں کا فکری اور اخلاقی معیار بہت بلند دیکھنا چاہتے تھے۔ اور ان کے فرائض و اختیارات میں وسعت اور استحکام کے خواہاں تھے۔ ان تمام ہمہ گیر مصروفیات کے ساتھ وہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف شائع ہونے والے مستشرقین کے مقالات اور تصانیف کا جائزہ بھی لیتے رہتے تھے۔ اور ان کا جواب لکھتے تھے۔ انکے بعض مقالات "الاسلام و النصرانیة مع العلم و المدینة" کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوئے ہیں۔ ان مقالات کی جامعیت اور قوت استدلال کا اعتراف خود مستشرقین نے کیا ہے۔ (۲۷)

زندگی کے آخری لمحہ تک انہوں نے اپنا مشن جاری رکھا، خدیو اسماعیل کی خود پسندی اور مفاد پرستی کی وجہ سے شدید اختلافات بھی ہوئے۔ اور ایک وقت وہ بھی آیا جب افتاء کی ذمہ داری سے استعفی دیدیا لیکن مختلف کمیٹیوں اور انجمنوں سے وابستگی، اہم معاشرتی، سیاسی اور دینی مسائل پر مقالات کی تصنیف، تعلیمی اداروں کے نصاب تعلیم اور طرز تعلیم میں اصلاح کے لئے جد و جہد اور اسلام مخالف پروپگنڈوں کے منہ توڑ جواب دینے کا سلسلہ آخیر عمر تک جاری رہا اور اس وقت بھی جبکہ ڈاکٹروں نے ان کے مرض (کینسر) کی سنگینی سے انہیں مطلع کر دیا تھا، وہ اپنے کام میں مصروف رہے۔ بالآخر ۵۹ سال کی عمر میں ۱۱ جولائی ۱۹۰۵ء کو وہ مالک حقیقی سے جاملے۔ انکے انتقال پر مصر میں عوامی اور حکومتی سطح پر سوگ منایا گیا اور ان کی موت کو عالم اسلام کیلئے ایک عظیم نقصان قرار دیا گیا۔ (۲۸)

سرمایۂ تفسیر

شیخ محمد عبدہ نے قرآن مجید کا درس بھی دیا اور اس کی تفسیر بھی لکھی۔ البتہ ان کے درس کا حصہ تفسیر کے بالمقابل زیادہ ہے۔ وہ مختلف وجوہ کی بنا پر تفسیر لکھنے کی ضرورت کے قائل نہیں تھے۔ انکے شاگرد رشید رضا کا بیان ہے کہ انہوں نے اپنے استاد سے ملاقات کے بعد سب سے پہلی

تجویز قرآن مجید کی تفسیر لکھنے سے متعلق رکھی۔ لیکن انہوں نے یہ کہہ کر منع کردیا کہ تفاسیر کی تعدادیوں ہی بہت زیادہ ہے اور سب مل کر آیات قرآنی کی تشریح و توضیح کے ضروری پہلوؤں کا احاطہ کرلیتی ہیں۔ تفسیر لکھنے سے گریز کی دوسری بڑی وجہ لوگوں میں ذہنی و فکری استعداد کی کمی تھی۔ عموماً ان کے اندر اس طرح کی کتابوں سے خاطر خواہ فائدہ اٹھانے کی صلاحیت نہیں تھی۔ شیخ محمد عبدہ کہا کرتے تھے کہ مصری کتب خانوں میں کتابوں کی کمی نہیں بلکہ بیدار مغز، ذود فہم اور کثیر المطالعہ افراد کی کمی ہے۔(۲۹)

وہ تقریر اور درس قرآن کی اہمیت اور اثر انگیزی کے معترف تھے۔ ایک مقرر اپنے مدعا کے اظہار کے لئے الفاظ کے علاوہ حرکات و سکنات سے بھی مدد لیتا ہے۔ اس کی نظر اپنے مخاطب پر مرکوز ہوتی ہے اور مخاطب بھی اس کی باتوں کو غور سے سنتا ہے اور حسب ضرورت مشتبہ اور مشکل امور کی مزید وضاحت طلب کرتا ہے۔ اس طرح اخذ و استفادہ کا امکان تقریر اور درس کی شکل میں زیادہ ہوتا ہے۔(۳۰)

تقریر ہو یا تحریر ہر دو ذرائع سے شیخ محمد عبدہ کا جو کچھ تفسیری سرمایہ ہم تک منتقل ہوا ہے وہ مقدار میں کم ہونے کے باوجود قابل قدر اور لائق مطالعہ ہے۔ اس کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شیخ محمد عبدہ ذخیرہ تفسیر میں کسی اضافہ کے بجائے لوگوں کو قرآن مجید کے اصل پیغام اور اس کی حقیقی روح سے روشناس کرانا چاہتے تھے۔ اسی لئے آخری عمر کے دروس قرآن کے علاوہ انہوں نے کبھی بھی قرآن مجید کی سورتوں کا علی الترتیب از اول تا آخر درس کا ارادہ نہیں کیا۔ بلکہ وہ ایک موضوع کا انتخاب کرتے تھے۔ اور اس سے متعلق قرآنی آیات کو یکجا کرکے ان کی روشنی میں گفتگو کرتے تھے۔ انہوں نے تفسیر قرآن کے موضوع پر جو کچھ لکھا ہے اسکی کسی قدر تفصیل درج ذیل ہے۔

ا۔ **تفسیر پارہ عم** (۳۱):۔ اسے انہوں نے " **الجمعية الخيرية الاسلامية مصر** " کے ارکان کے مشورہ سے لکھا تھا۔ تاکہ یہ جمعیت کے زیر اہتمام قائم مدارس کے اساتذہ کے لئے ماخذ اور مرجع کے طور پر استعمال ہو سکے اور وہ اس کی مدد سے اپنے طلبہ کو اس پارہ کی سورتوں کے مطالب سے آگاہ کریں۔ یہ ایک مختصر تفسیر ہے۔ اس کی زبان آسان اور صاف ستھری ہے۔ اس میں مفسرین کے اختلافات اور نحو و لغت کے پیچیدہ مباحث سے بالکل تعرض نہیں کیا گیا ہے۔(۳۲)

۲۔ **تفسیر سورہ العصر**:۔ شیخ محمد عبدہ نے ۱۹۰۲ء میں بلاد مغرب کا سفر کیا تھا اس وقت انہوں نے الجزائر کے علماء اور مفکرین کی منتخب جماعت کے سامنے اس سورہ کے مطالب بیان کئے تھے ، یہ ایک طویل تفسیر ہے اور کل سات دنوں میں لکچرس کی شکل میں پیش کی گئی تھی۔(۳۳)

۳۔ **دروس من القرآن الکریم**:۔ یہ ان دروس قرآن کا مجموعہ ہے جو شیخ محمد عبدہ نے بیروت اور قاہرہ کی مساجد میں مختلف مواقع پر پیش کئے تھے، اس میں قرآن مجید کی ایک آیت یا کئی آیات کو منتخب کر کے ان کی تشریح و توضیح کی گئی ہے۔ اور ان کی روشنی میں مسلمانوں کو ان پر عائد ہونے والی ذمہ داریوں سے آگاہ کیا گیا ہے اور ساتھ ہی قرآن کی عظمت اور اسلام کی حقانیت کا اثبات کیا گیا ہے۔(۳۴)

۴۔ **تفسیر "المنار" از ابتدا تا سورہ النساء آیت نمبر ۱۲۶**:۔ یہ ان دروس کی تحریری شکل ہے جو شیخ محمد عبدہ نے اپنے احباب اور مریدین کے سامنے جامعہ ازہر میں دئے تھے۔ شیخ اس کے لئے تیار نہیں تھے لیکن محمد رشید رضا کے اصرار اور شدید خواہش پر آمادہ ہو گئے تھے۔ یہ سلسلۂ درس محرم ۱۳۱۷ھ سے محرم ۱۳۲۳ھ تک کل چھ سال جاری رہا۔ محمد رشید رضا کا معمول تھا کہ وہ اپنے استاد کے درس کی اہم باتیں نوٹ کر لیتے تھے۔ پھر بعد میں فراغت کے وقت اپنی یادداشت پر اعتماد کر کے مزید تفصیلات یکجا کر لیتے تھے۔ یہ دروس بعد میں افادۂ عام کی غرض سے مجلّہ "المنار" کے صفحات پر شائع ہونے لگے۔ لیکن اشاعت سے پہلے شیخ محمد عبدہ کے سامنے نظر ثانی کے لئے پیش کئے جاتے تھے۔ وہ حسب ضرورت اس میں حذف و اضافہ بھی کرتے تھے۔ لیکن اکثر و بیشتر اپنے شاگرد کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے تھے اور خوشی کا اظہار کرتے تھے۔(۳۵)

طریقۂ درس و تفسیر

قرآن مجید کی آیات کا درس ہو یا ان کی کتابت، شیخ محمد عبدہ ان دونوں میں ایک متعین نہج اور طریقہ کار کے پابند تھے، اس سلسلے میں سب سے اہم اصول قرآن مجید پر براہ راست غور وفکر اور اس سے اخذ و استفادہ تھا، وہ اس خیال سے کہ مبادا کسی مفسر کی رائے سے متاثر نہ ہوں، بالعموم کسی تفسیر سے رجوع نہیں کرتے تھے، ہاں اگر عربی زبان یا اعراب سے متعلق کوئی

پیچیدہ مبحث ہوتا تھا تو بقدر ضرورت کسی تفسیر سے مراجعت کر لیتے تھے۔ اپنے اصول کی صراحت شیخ محمد عبدہ نے خود کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

" لانني لا اطالع قبل ان اقرا لكنني ربما اتصفح كتاب تفسير اذا كان هناك وجه غريب في الاعراب او نكتة غريبة في اللغة "

(۳۶)

(میں درس دینے سے پہلے کسی تفسیری کتاب کا مطالعہ نہیں کرتا ہوں البتہ جب کبھی اعراب یا زبان سے متعلق کوئی عجیب و غریب شکل سامنے آجاتی ہے تو کسی تفسیر کی کتاب کی ورق گردانی کر لیتا ہوں۔)

آیات کی تشریح و توضیح میں وہ اصلاً اپنی عقل پر اعتماد کرتے تھے ان کا یہ خیال تھا کہ اگر عقل کا صحیح استعمال کیا جائے تو مطالب تک رسائی کے لئے اس سے بہتر اور موثر کوئی دوسرا ذریعہ نہیں۔ (۳۷)۔ چنانچہ وہ آیات کی تلاوت کے بعد قرآن مجید کے استعمالات اور زبان و بلاغت کے اصولوں کی روشنی میں ان کے معانی کا تعین کرتے تھے۔ وہ اس امر کا پورا اہتمام کرتے تھے کہ ان کی تشریحات جدید انسان کے فکری معیار سے متصادم نہ ہوں۔

اظہار اور تعبیر کے باب میں بھی انکا ایک منفرد طریقۂ کار تھا۔ وہ ان مقامات پر قدرے تفصیل اور وضاحت سے کام لیتے تھے جہاں بالعموم مفسرین نے غفلت اور کوتاہی کا مظاہرہ کیا ہے اور ان مسائل کے سلسلے میں انتہائی مختصر گفتگو کرتے تھے جو مفسرین کی دلچسپیوں کے اصل مرکز تھے جیسے لغت، اعراب اور بلاغت کے مباحث یا قصص و حکایات اور تاریخی اشخاص و مقامات وغیرہ کی تفصیلات۔ (۳۸)

تحریر یا تقریر سے قبل وہ اپنے سامعین یا مخاطبین کے ذہن و مزاج کا بخوبی اندازہ کر لیتے تھے۔ اگر ماحول سازگار ہوتا اور لوگ اخذ و استفادہ کے لئے آمادہ ہوتے تو وہ کتاب اللہ کے مطالب بیان کرتے، بصورت دیگر اجتناب کی راہ اختیار کرتے، دوران درس بھی وہ اپنے اس اصول کا پاس رکھتے تھے، چنانچہ اگر وہ محسوس کر لیتے کہ مجلس میں کم فہم یا کند ذہن لوگوں کی اکثریت ہے اور وہ سننے سمجھنے کی مطلوبہ صلاحیت سے عاری ہیں تو وہ اپنے درس میں حد درجہ اختصار سے کام لیتے۔ اس کے برعکس اگر مجلس میں توجہ اور انہماک

سے سننے کا ماحول ہوتا اور لوگوں کی ذہنی و فکری سطح بلند نظر آتی تو وہ قرآن پاک کے اسرار و رموز کو تفصیل کے ساتھ بیان کرتے۔(۳۹) مکمل تفسیر قرآن لکھنے سے اجتناب کی وجہ بھی یہی تھی کہ وہ مصر میں پڑھنے لکھنے کے شوقین اور غور و فکر کرنے کے عادی اشخاص کی حد درجہ کمی پاتے تھے۔ان کا خیال تھا کہ ایسے لوگوں کے سامنے آیات قرآن کی تفسیر سے اس کتاب کی عظمت اور وقار کو نقصان پہنچے گا۔

مشہور مصری مفکر ڈاکٹر احمد امین نے شیخ محمد عبدہ کے طریقۂ تفسیر پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انہیں جب کسی عقیدہ سے متعلق آیت کی تشریح کرنی ہوتی تو سب سے پہلے وہ قرآن مجید کی ان آیات کا حوالہ دیتے جہاں اس عقیدہ کا تذکرہ ہوتا۔ان سب کی مدد سے وہ اس عقیدے کے بنیادی خدوخال واضح کرتے۔پھر مسلم معاشرہ میں اس عقیدے کے تعلق سے جو فساد آیا ہے اس کی وضاحت کرتے اور اس فساد کے تدارک کی شکلیں بتاتے۔اسی طرح اگر اخلاقیات یا معاشرت سے متعلق کوئی آیت ہوتی تو سب سے پہلے وہ اخلاقیات کی اہمیت واضح کرتے۔پھر قوموں کے عروج و زوال اور صلاح و فساد میں ان کے کلیدی کردار کی تفصیلات بیان کرتے۔معاشرتی مسائل کے تذکرہ میں وہ انتہائی خوش اسلوبی سے اقوام عالم اور مسلم ممالک کی صورتحال کا جائزہ لے لیتے اور ان کی بہتری اور اچھائی کے تعلق سے انتہائی مفید مشورے دیتے۔اس طرح ان کی تفسیر کو عملی یا اخلاقی تفسیر کہا جا سکتا ہے۔ان کی تفسیر کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں تقویٰ، خدا ترسی اور روحانیت کے اعلیٰ معیار کی وضاحت کی گئی ہے اور نفس انسانی کو ان تک رسائی حاصل کرنے کے لئے شوق و رغبت دلائی گئی ہے۔اس معنی میں ہم اسے روحانی تفسیر بھی کہہ سکتے ہیں۔(۴۰)

فہم قرآن کی ضرورت واہمیت

فہم قرآن کی ضرورت واہمیت کے سلسلہ میں انہوں نے تفسیر المنار کے مقدمہ میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان کا خلاصہ ذیل کی سطروں میں پیش کیا جاتا ہے۔

قرآن مجید ایک ایسی کتاب ہے جسے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے نازل فرمایا ہے۔اس میں انسان کو اس کی تخلیق کی غرض و غایت، کائنات کے اندر اس کے مقام و مرتبہ اور اس کے حدود و اختیارات سے آگاہ کیا گیا ہے اور اس کی تعلیمات کے مطابق

زندگی بسر کرنے کی شکل میں اسے دنیا و آخرت کی سعادت اور فلاح کی ضمانت دی گئی ہے۔ قرن اول کے مسلمانوں نے قرآن مجید کے اس پیغام کو اچھی طرح ذہن نشین کرلیا تھا ۔چنانچہ اللہ تعالیٰ کی مدد اور تائید ان کے شامل حال ہوئی اور وہ اس دنیا کے ایک بڑے حصے پر غالب ہوگئے۔ ان کی عظیم فتوحات کا واحد سبب ایمان و یقین، صبر و استقامت اور عزم و حوصلہ پر مبنی وہ قوت و طاقت تھی جو قرآن مجید کی تلاوت اور مطالعہ سے انہیں حاصل ہوئی تھی۔ دراصل قرآن مجید تمام قوتوں کا منبع اور تمام علوم و فنون کا ماخذ ہے، یہ ایک ایسا نسخۂ کیمیا ہے جو انسان کے دلوں میں خالق حقیقی سے عشق و محبت کا رس گھول دیتا ہے اور معبودان باطل سے حد درجہ نفرت کا داعیہ پیدا کرتا ہے۔(۴۱)

ان سب تفصیلات کے بیان کرنے کا مقصود یہ ہے کہ دور حاضر کے مسلمان قرآن مجید کی قدر و منزلت سے آگاہ ہوں۔ آج ان کا حال یہ ہے کہ وہ اس عظیم کتاب کے فہم سے عاری ہیں۔ وہ قرآن کے الفاظ اپنی زبانوں سے ادا کر لیتے ہیں لیکن ان کی روح ان کے قلب وجگر کی گہرائیوں تک نہیں پہنچ پاتی۔ وہ اسلام کے احکام پر عمل کرتے ہیں لیکن ان کی زندگیاں ان کے اثرات سے خالی ہیں۔ انہوں نے قرآن کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جو وہ اسلام اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کر رہے ہیں۔ وہ اپنی قسموں میں خدا، رسول اور قرآن کا بے دریغ حوالہ دیتے ہیں۔ انہیں یہ معلوم نہیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ دراصل قرآن انہیں ورثے میں ملا ہے۔ انہوں نے کبھی اس کے مطالب پر غور کرنے کی زحمت نہیں کی۔ وہ اس کی تعظیم و تکریم کے ظاہری آداب بجالاتے ہیں۔ اسے طاقوں میں سجاتے ہیں۔ حریر و ریشم کے جزدان میں رکھتے ہیں۔ امراض اور مصیبتوں سے نجات کے لئے اس کی تعویذ بھی بناتے ہیں اور ارواح خبیثہ سے نجات کیلئے اس کی آیت لکھ کر اپنے گھروں میں آویزاں کرتے ہیں۔ کاش کہ انہیں معلوم ہوتا کہ عقیدت و محبت کے ان مظاہر سے قرآن کی تکریم میں اضافہ کے بجائے اس کی شان میں گستاخی ہوتی ہے۔ دوسری طرف ہمارے قراء حضرات کا یہ حال ہے کہ وہ مخارج کی ادائیگی اور آواز کے حسن پر پوری توجہ صرف کئے ہوئے ہیں اور فہم کے لئے ان کے پاس کوئی وقت نہیں۔ اسی لئے آج کی جاہلیت دور اول کی جاہلیت سے زیادہ سنگین معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس زمانے میں کچھ ایسے بھی لوگ تھے جو قرآن کو خوب اچھی طرح سمجھتے تھے۔(۴۲)

(یعرفونہ کما یعرفون ابنائھم)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ قرآن مجید کا سمجھنا اور اس سے ہدایت حاصل کرنا ہر مسلمان پر لازم ہے کیونکہ قرآن مجید کے نزول کی غرض و غایت فہم کلام کے بغیر پوری نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح قرآن کی تعلیمات اور شریعت اسلامی کی مصالح سے واقفیت اور انسانی زندگی پر ان کی اثر انگیزی بھی فہم قرآن پر موقوف ہے۔ مسلمانوں کے فکر و عمل کا استحکام اور دوام بھی اسی سے ممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امت مسلمہ ہر زمانے اور ہر دور میں فہم قرآن کی ضرورت و اہمیت پر متفق رہی ہے۔ اور عہد رسالت کا ہر مسلمان واقعۃً اس قرآن کو سمجھتا تھا اور اس پر عمل کرتا تھا۔ (۴۳)

فہم قرآن کے لزوم کی جو بات اوپر کہی گئی ہے اس سے مراد قرآن کا ایسا فہم ہے جس سے انسان اپنے رب کی پسند و ناپسند اور اپنے فرائض اور حدود و اختیارات سے آگاہ ہو جائے۔ ظاہر ہے اس طرح کا فہم ہر اس انسان سے ممکن ہے جو عربی زبان سے واقف ہو گا۔ اس کے لئے اسے بہت زیادہ محنت اور مشقت نہیں اٹھانی پڑے گی۔ یہی وہ فہم ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ہر خاص و عام کے لئے آسان بنا دیا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے۔ (۴۴)۔ " ولقد یسر نا القرآن للذکر فھل من مدکر "

تفسیر کا مطلوبہ معیار

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے۔ یہ انسانیت کے لئے خدا کا آخری ہدایت نامہ اور مکمل نظام حیات ہے۔ اور انسانوں کی دنیوی و اخروی فلاح و کامرانی کا ضامن ہے۔ قرآن سے متعلق مذکورہ بالا حقائق سے اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس لئے عقل و خرد کا یہ تقاضا ہے کہ اس کی تفسیر کی جو کاوش بھی کیجائے اس میں مذکورہ امور کی پوری رعایت کی جائے اور ان سے انحراف نہ کیا جائے۔ شیخ محمد عبدہ کی نظر میں تفسیر کا مطلوبہ معیار یہی تھا۔ یعنی یہ کہ کتاب اللہ کو کتاب رشد و ہدایت تسلیم کر کے اس کا مطالعہ کیا جائے اور اسکے مطالب کی تشریح و توضیح میں اس کی اس امتیازی شان کو ملحوظ رکھا جائے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

التفسیر الذی نطلبہ ھو فھم الکتاب من حیث ھو دین یرشد الناس إلی مافیہ سعادتھم فی حیاتھم الدنیا و حیاتھم الآخرۃ فان ھذا ھو

المقصد الاعلیٰ منه و ما وراء هذا من المباحث تابع له وداء؟ او وسیلة لتحصیله. (۴۵)

"ہم جس طرح کی تفسیر چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ کتاب اللہ کو اس طرح سمجھا جائے کہ دراصل وہ ایک ایسا دین ہے جو لوگوں کو دنیوی اور اخروی سعادت سے ہمکنار کرنے والا ہے۔ کیونکہ یہی قرآن مجید کے نزول کا اصل مقصد ہے۔ اس کے علاوہ جتنے مباحث ہیں ان کی حیثیت مذکورہ مقصد کی تحصیل کے ذریعے کی ہے یا وہ اسی کے تابع ہیں"

تفسیر المنار کے مقدمہ میں علامہ رشید رضا نے بہت تفصیل سے اپنے استاذ کے خیالات کی وضاحت کی ہے۔ اس میں انہوں نے بتایا ہے کہ قدیم زمانے سے لیکر اب تک جو تفاسیر لکھی گئی ہیں ان میں سے ہر ایک میں چند متعین مقاصد پیش نظر رہے ہیں اور انہی کی تفصیل و تشریح پر ان کی مولفین کی توجہ مرکوز رہی ہے۔ لیکن دیکھا یہ گیا ہے کہ اکثر و بیشتر تفاسیر میں قرآن مجید کے اصل پیغام پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ ان میں ایسے مباحث کی کثرت ہے جو لوگوں کو کتاب کے اصل مقصد سے غافل کر دیتے ہیں اور انہیں غیر مفید باتوں میں الجھا دیتے ہیں۔ اسی لئے محمد عبدہ بار بار تاکید کے ساتھ یہ بات کہتے ہیں کہ وہ کتاب اللہ کو اللہ رب العالمین کی طرف سے ہدایت کی کتاب سمجھتے ہیں اور اسکی تعلیمات پر عمل کو انسانوں کی دنیوی و اخروی سعادت کا باعث تسلیم کرتے ہیں اور یہ کہ وہ قرآن کی جو تفسیر بھی لکھتے ہیں اس میں قرآن مجید کا یہ وصف ہمیشہ ان کے پیش نظر رہتا ہے۔ (۴۶)

شیخ محمد عبدہ نے قدیم کتب تفسیر کا مطالعہ کیا تھا ان کے سامنے تمام مفسرین کے مناہج تفسیر واضح تھے۔ وہ چاہتے تو ان کی اتباع کرتے ہوئے ان ہی کے طرز کی ایک اور تفسیر لکھ ڈالتے۔ یا کم از کم ان کی مدد سے ایک نئی چیز ترتیب دے دیتے لیکن ان کے یہاں تو تفسیر کا مطلب ہی کچھ اور تھا۔ اس کے بغیر تفسیر بے معنی اور سعی لاحاصل تھی۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"عصر حاضر میں اور اس سے صدیوں پہلے سے تفسیر کا مطلب صرف یہ سمجھا جاتا ہے کہ مفسرین کے اقوال سے واقفیت حاصل کی جائے حالانکہ ان کے اقوال میں اس قدر اختلاف اور تضاد پایا جاتا ہے کہ وہ قرآن کی شان سے

بالکل مطابقت نہیں رکھتے۔اے کاش کہ اقوال مفسرین کے یہ طالبین اپنی عقل و فہم سے کام لے کر قرآنی الفاظ کے معانی معلوم کرتے اور ان کو لوگوں کے سامنے پیش کرتے۔ مگر افسوس کہ انہوں نے ایسا نہیں کیا۔وہ صرف اس بات کے خواہاں ہیں کہ دوسروں پر اپنی علمیت کا رعب جمانے اور بحث و مباحثہ میں غلبہ حاصل کرنے کے لئے مفسرین کے زیادہ سے زیادہ اقوال جمع کردیں اور انہیں یاد کرلیں۔پھر اعراب اور تاویل سے متعلق نادر اور عجیب و غریب شکلیں پیش کریں جنکا مقاصد نزول قرآن سے کوئی سروکار نہ ہو"(۴۷)

شیخ محمد عبدہ نے تفسیر کے بارے میں اپنے مرکزی نظریے کے اظہار اور عام مفسرین کی روش پر تنقید کے علاوہ تفسیر سے متعلق ایک ہمہ گیر خاکہ بھی پیش کیا تھا۔انہوں نے اپنے عمیق مطالعہ اور کشادہ ذہن سے کام لے کر کسی تفسیر کی عمدگی اور کامیابی کے لئے پانچ شرطوں کی موجودگی ضروری قرار دی ہے۔ان میں سے پہلی شرط قرآن مجید میں مستعمل مفرد الفاظ کی تحقیق اور ان کی کنہ و حقیقت کا ادراک ہے۔یہ ملکہ کلام عرب کے مطالعہ اور اہل لغت کی تصریحات سے آگہی کے بعد پیدا ہوتا ہے۔دوسری شرط اسالیب زبان سے واقفیت ہے۔یہ صلاحیت بھی فصیح و بلیغ کلام کے مطالعہ اور مشق و ممارست سے پیدا ہوگی۔تیسری شرط قوموں اور اشخاص کے احوال و ظروف کا علم ہے۔جس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں مختلف مقاصد کے تحت تاریخ انسانی کی بعض اقوام اور اشخاص کا ذکر کیا ہے۔ان کے مطالعہ سے ان قوموں اور افراد کے عروج و زوال اور اقبال و ادبار میں کارفرما قوانین فطرت اور سنت الٰہی سے واقفیت ہوتی ہے۔اس لئے ایک مفسر کو تاریخ عالم اور انسانی نفسیات سے باخبر ہونا چاہیے۔چوتھی شرط عہد جاہلیت اور عہد رسالت پر گہری نظر ہے کیونکہ اس سے یہ معلوم ہوگا کہ قرآن مجید نے کفر و شرک کی آلودگیوں میں ملوث انسانیت کو ایمان و عقیدہ کی کتنی عظیم نعمت سے ہمکنار کیا۔اور اس کتاب کی تعلیمات نے لوگوں کی زندگیوں میں کس قدر بڑا انقلاب برپا کیا۔پانچویں شرط نبی کریمؐ اور ان کے اصحاب کی سیرت کا مطالعہ ہے کیونکہ اس سے قرآن کے افکار کی عملی تعبیر دیکھنے کا موقع ملے گا اور اس حقیقت پر یقین اور

زیادہ پختہ ہوگا کہ قرآن انسانی قلوب کی تطہیر اور ان کا تزکیہ کرنے کے لئے آیا ہے۔(۴۸)
مذکورہ بالا صراحتوں پر ایک نظر ڈالنے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ محمد عبدہ کی نظر میں قرآن مجید کی حقیقی تفسیر وہ ہے جس میں مفسر قرآن پاک کے مقصد نزول کو اساسی اہمیت دے۔ پھر قرآن کے استعمالات اور اپنے ذوق و وجدان کی روشنی میں وہ آیات کے مطالب بیان کرے۔ اور اپنی تشریحات میں اس امر کا اہتمام کرے کہ ان سے انسان کو روحانی مسرت حاصل ہو اور وہ عمل و ہدایت کی راہ پر گامزن ہو۔ اس طرح کی تفسیر میں نحو و بلاغت کے مسائل انتہائی اختصار کے ساتھ اور بقدر ضرورت زیر بحث آئیں گے اور اس حد تک ہونگے کہ قرآن کے پیغام کے لئے حجاب نہ بنیں۔ اس میں اصل اہمیت غور و فکر اور فہم و تدبر کو حاصل ہوگی اور تقلید و اتباع کے لئے کوئی جگہ نہ ہوگی۔(۴۹)

سورتوں کی موضوعاتی وحدت

جیسا کہ وضاحت ہو چکی ہے کہ شیخ محمد عبدہ کے نزدیک تفسیر قرآن کا سب سے اہم ماخذ خود قرآن کریم ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کی تنزیل کی طرح اس کے مطالب اور مفاہیم کی وضاحت بھی اپنے ذمہ لی ہے، چنانچہ اگر پورے قرآن کو غور سے پڑھا جائے اور اس میں مذکورہ حقائق کو اس کے اپنے بیانات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی جائے تو مشکلات فہم قرآن پر بآسانی قابو پایا جاسکتا ہے۔ "قرآن کی تفسیر قرآن کے ذریعہ ہو" اس اصول کے انطباق کے کئی ایک پہلو ہیں (۵۰)۔ ان ہی میں سے ایک موضوعاتی وحدت بھی ہے کیونکہ اگر کسی سورہ کا کوئی موضوع متعین کر لیا جائے تو اس کی روشنی میں سورہ کی آیات کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔

شیخ محمد عبدہ قرآن مجید کو ایک منظم اور مربوط کلام مانتے ہیں۔ ان کی نظر میں قرآن حکیم کے تمام اجزاء اس کے اساسی مقاصد نزول سے ہم آہنگ ہیں اور ان کے مابین کوئی اختلاف یا تضاد نہیں ہے۔(۵۱) قرآن مجید کی ہر سورہ اس کے مقاصد نزول میں سے کسی ایک کی زیادہ تفصیل سے وضاحت کرتی ہے جبکہ اس میں دیگر مقاصد کا تذکرہ ضمنی ہوتا ہے۔ سورتوں کے اس اختصاص و امتیاز کو ہم دوسرے الفاظ میں مرکزی موضوع کہتے ہیں۔

شیخ محمد عبدہ نے اپنی تفسیر میں سورتوں کے مرکزی موضوع کو بہت زیادہ اہمیت دی

ہے۔اسی لئے آیات کی تشریح کے دوران جگہ جگہ مرکزی موضوع کا حوالہ دیا ہے۔ان کا یہ انداز تفسیر پارۂ عم میں خاص طور سے نمایاں ہے جہاں اکثر و بیشتر سورتوں کی تفسیر سے پہلے ان کے موضوع کی نشاندہی کی ہے۔ پھر دوران تفسیر آیات کے ان کے مرکزی موضوع سے ربط کی وضاحت کی ہے۔یہی نہیں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر انہوں نے کبھی کبھی دو یا تین سورتوں کے درمیان بھی موضوعاتی ربط ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔چنانچہ سورہ الانفطار کے شروع میں انہوں نے "سورہ التکویر" سے موضوعاتی تعلق کی نشاندہی کی ہے۔(۵۲)

انہوں نے سورہ فاتحہ اور سورہ بقرہ کی تفسیر میں اور زیادہ کے وضاحت کے ساتھ اپنی فکر کو پیش کیا ہے۔وہ تفسیر سورہ "الفاتحہ" کے مقدمہ میں لکھتے ہیں۔

> " ان الفاتحة قد اشتملت اجمالا علیٰ الاصول التی یفصلها القرآن تفصیلا فکان انزالها اولا موافقا لسنة الله تعالیٰ فی الابداع و علی هذا تکون الفاتحة جدیرة بان تسمی ام الکتاب " (۵۳)
>
> "بلاشبہ سورہ فاتحہ ان اصولوں پر مشتمل ہے جن کی پورے قرآن میں تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔اس طرح سورہ فاتحہ کا پہلے نازل کیا جانا اللہ تعالیٰ کے قانون تخلیق کے عین مطابق ہے اور اسی وجہ سے سورہ فاتحہ اس بات کی مستحق ہے کہ اسے ام الکتاب کہا جائے"۔

تفسیر سورۂ فاتحہ کے مقدمہ میں انہوں نے ان اصولوں اور مقاصد کی صراحت بھی کی ہے جو ان کے نزدیک پورے قرآن مجید میں اساسی اور مرکزی نوعیت کے ہیں۔اور جن کا انتہائی مجمل تذکرہ سورہ الفاتحہ میں ہے۔وہ بنیادی مقاصد کل پانچ ہیں۔

(۱) توحید (۲) انذار و تبشیر (۳) عبادات (۴) سعادت (۵) قصص و حکایات۔(۵۴)

اسی طرح سورہ البقرہ کے آغاز میں بھی انہوں نے اس کے مشتملات کی وضاحت کی ہے۔ جو ان کی نظر میں اسلام کی طرف دعوت اور عقائد و عبادات اور احکام شریعت کی تفصیلات کا احاطہ کرتی ہے۔(۵۵) موضوع کے تعین کے بعد اس سورہ کی تمام آیات کا اس سے ربط و تعلق ثابت کرنے کا مرحلہ آتا ہے۔انہوں نے یہ کام بھی انتہائی اہتمام کے ساتھ انجام دیا۔چنانچہ سورہ البقرہ کی تفسیر کے دوران جگہ جگہ اس کے مرکزی موضوع کا تذکرہ ملتا ہے۔

الغرض شیخ محمد عبدہ سورتوں کی موضوعاتی وحدت کو ایک مسلم حقیقت اور فہم قرآن کا ایک اہم ذریعہ سمجھتے ہیں۔ انھیں ان مفسرین پر سخت حیرت ہے جنھوں نے غور فکر کی کمی کے باعث آیات کے مابین ربط و تعلق اور سورہ کے مرکزی موضوع پر مشتمل ہونے کا انکار کر دیا۔ اسکی وجہ انکی نظر میں مفسرین کرام کا شان نزول سے متعلق روایات پر حد سے زیادہ اعتماد و انحصار ہے۔ یہ روایات سورتوں کی آیات کو الگ الگ ٹکڑوں میں تقسیم کر دیتی ہیں اور انھیں ایک دوسرے کیساتھ ملا کر پڑھنے اور غور و فکر کرنے سے ایک مفسر کو روک دیتی ہیں۔ بلا شبہ یہ روایات قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت کے منافی ہیں اور فہم قرآن کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ اس لئے ان سے اجتناب لازم ہے (۵۶)

قرآن مجید :۔ عقائد و افکار کا اصل مرجع :

"تفسیر القران بالقرآن" کے اصول کا ایک اہم فائدہ یہ ہے کہ اسکی مدد سے مفسر کو صحیح عقائد تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔ ہمارے قدیم مفسرین میں سے کچھ لوگوں نے اس اصول کو نظر انداز کر دینے کے سبب سخت قسم کی فکری و اعتقادی ٹھوکریں کھائی ہیں۔ کچھ فرقوں اور دینی گروہوں نے یہ جرأت بھی کی کہ اپنے مفروضہ خیالات کی تائید میں قرآنی آیات اور الفاظ کی من مانی تاویلیں کیں۔ جن کے باعث صحیح دینی معتقدات انکی نظروں سے ہمیشہ کیلئے اوجھل ہو گئے۔ شیخ محمد عبدہ امت مسلمہ کی فکری تاریخ کے اس سقم اور اس کے اسباب سے واقف تھے۔ وہ ایک دینی مصلح تھے۔ اس لئے انھوں نے اس فکری کجروی کی اصلاح پر خصوصی توجہ دی۔ اس سلسلے میں انھوں نے سب سے زیادہ زور قرآن کی اس حیثیت کے اثبات پر صرف کیا کہ وہی اصل معیار و میزان ہے، اس پر رکھ کر عقائد کی صحت و صداقت اور قدر و قیمت کا اندازہ کیا جانا چاہئے۔ اور اسے مصدر و ماخذ تسلیم کر کے افکار و خیالات کا اخذ و استنباط کیا جانا چاہئے۔ اپنی اس فکر کی وضاحت وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں :۔

" اريد ان يكون القرآن اصلاً تحمل عليه المذاهب والآراء فى الدين لا ان تكون المذاهب اصلاً والقرآن هو الذى يحمل عليها ويرجع بالتاويل والتحريف اليها كما جرى عليه المخذلون وتاه فيه الضالون (۵۷)

میں یہ چاہتا ہوں کہ قرآن کو اصل اور مرجع کی حیثیت حاصل ہو اور مذہبی و مسلکی افکار و خیالات اس سے مستنبط اور اس پر محمول ہوں۔ یہ ہرگز نہ ہو کہ مذاہب و مسالک کو اصل قرار دے کر قرآنی مندرجات میں تحریف و تاویل کے ذریعہ ان سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کیجائے، کیونکہ یہ گمراہ لوگوں کا طریقہ کار ہے۔

انہوں نے اپنے اس نظرے کی وضاحت کے لئے ان مفسرین پر سخت تنقید کی ہے جو مخصوص عقائد و افکار کی عینک سے قرآن کریم کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس کے نتیجہ میں قرآنی مضامین کو اپنے عقائد کے سانچہ میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مشہور مصری مفکر ڈاکٹر عثمان امین نے لکھا ہے کہ

"شیخ سب سے زیادہ ان مفسرین پر ناراض تھے جنہوں نے اپنی تفسیروں میں قرآنی الفاظ سے کھلواڑ کیا اور اس سے عجیب و غریب معانی مستنبط کئے۔ اس لئے وہ قرآن کی تفسیر میں عقل کی کارفرمائی کو بہت ضروری سمجھتے تھے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ جب بھی کوئی مشتبہ نص ہمارے سامنے آئے تو سب سے بہتر اور مناسب طریقہ یہ ہے ہم اس سے اپنی لاعلمی کا اظہار کریں اور اس کے صحیح علم کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کردیں۔ دوسری شکل یہ ہے کہ ہم اس کی ایسی تاویل کریں جو مقبول عام قرائن کے مطابق، اسلام کی روح سے ہم آہنگ اور عربی زبان و قواعد کے موافق ہو" (۵۸)

"شیخ محمد عبدہ اس حقیقت پر کامل یقین رکھتے تھے کہ وہ افکار و خیالات جن کی بنیاد ظن و تخمین اور وہم و گمان پر ہوتی ہے اور جو قرائن سے ماخوذ نہیں ہوتے وہ اس قابل نہیں کہ ان پر توجہ دی جائے۔ عقل سلیم بھی ان سے ابا کرتی ہے۔ کیونکہ دین کا عقل سے بہت گہرا تعلق ہے۔ اور یہ دونوں اوہام و خرافات کو قبول نہیں کرتے۔ (۵۹)

عقل و فکر کا استعمال اور تقلید و اتباع سے اجتناب

شیخ محمد عبدہ کے نزدیک تفسیر قرآن میں انسانی عقل و فہم کا استعمال اور شعور و وجدان کی رعایت ناگزیر ہے۔ انہوں نے اپنی تفسیر میں قرآن حکیم کی غایت اولیٰ اور اس کے نزول کے اساسی مقصد کی وضاحت کے ساتھ ساتھ تدبر و تفکر اور اجتہاد و استدلال کی ضرورت و اہمیت

کو ابھار کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ دراصل وہ خود ایک عظیم مفکر اور مدبر تھے اور حریت فکر واظہار رائے کو انکے اصلاحی و تجدیدی مشن میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔(۶۰)۔ازہری علماء میں وہ تنہا شخص تھے جنہوں نے جامعہ ازہر میں تجدید، تعقل اور اجتہاد کا علم بلند کیا اور حریت فکر و نظر کا دفاع کیا۔ اس کے نتیجے میں روایت پسند حلقوں کی طرف سے شدید مخالفت کی گئی لیکن علم و مشاہدہ پر مبنی اور کتاب و سنت سے ماخوذ فکر میں انہوں نے کوئی تبدیلی نہیں کی۔ ظاہر ہے ان کے ان افکار سے ان کی تفسیر کا متاثر ہونا لازمی امر تھا، چنانچہ تفسیر المنار کے مقدمہ میں وہ قرآن عزیز کی فہم صحیح پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"أعنی بالفهم ما یکون عن ذوق سلیم تصیبه اسالیب القرآن بعجائبها و تملکه مواعظه فتشغله عما بین یدیه مما سواه .لا ارید الفهم الماخوذ بالتسلیم الاعمی من الکتب اخذا جافالم یصحبه ذلك الذوق و ما یتبعه من رقة الشعور و لطف الوجدان الذین هما مدار العقل و التأثر و الفهم و التدبر ." (۶۱)

فہم قرآن سے میری مراد وہ فہم ہے جو ذوق سلیم سے عبارت ہو جس پر قرآن مجید اپنے اسالیب کی تمام تر ندرتوں کے ساتھ اثر انداز ہو اور جس پر اس کی حکمت و موعظت کے عناصر کا غلبہ ہو اور اس کے نتیجے میں آدمی اپنے گرد و پیش سے غافل ہو کر قرآن میں گم ہو جائے۔ میں ایسی فہم ہرگز مراد نہیں لیتا جو تفسیر کی کتابوں کی اندھی تقلید اور بے جان استفادہ پر مبنی ہو۔ اور جس میں ذوق سلیم، احساس لطیف اور وجدان نفس کا کوئی دخل نہ ہو۔ حالانکہ فہم و تدبر اور تاثیر و تفہیم کا انحصار ان ہی ساری باتوں پر ہے۔

مذکورہ اقتباس میں عقل کے ساتھ ذوق و وجدان سے مطابقت بھی فہم صحیح کے لئے ضروری قرار دی گئی ہے۔ کیونکہ شیخ محمد عبدہ کا یہ خیال ہے کہ قرآن مجید کی دعوت نے جس طرح انسان کی عقل و شعور کو مطمئن کیا اسی طرح اس نے اس کے جذبات و عواطف کو بھی تسکین و طمانیت عطا کی۔(۶۲) اسی لئے وہ ایک مفسر کے لئے زبان کا بہترین ملکہ اور اسالیب کا اچھا ذوق بھی ضروری قرار دیتے ہیں۔ اس کے بعد ہی وہ اس قابل ہو گا کہ قرآن کے حسن

بیان کو سمجھ سکے اور دوسروں کے سامنے اسے پیش کر سکے۔(۶۳)

شیخ محمد عبدہ نے اپنی تفسیر میں مذکورہ اصول کا پورا خیال رکھا ہے۔ چنانچہ وہ جب تفسیر بیان کرنے یا لکھنے کا قصد کرتے تو تفسیر کی کوئی کتاب اپنے سامنے نہیں رکھتے کیونکہ اس سے اس کے مولف کے خیالات سے متاثر ہونے کا اندیشہ رہتا تھا(۶۴)۔ تقلید و اتباع سے بلند ہو کر جب انہوں نے اپنے وسیع علم و مطالعہ کی روشنی میں کتاب الٰہی کی تشریح کی تو فکر و عمل کی نئی جہات لوگوں کے سامنے آئیں۔(۶۵)۔اور قرآن کا پیغام علم جدید اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگ نظر آنے لگا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ قرآن پر مجتہدانہ غور و فکر اور جدید انسان کے عقلی معیار کے مطابق قرآن حکیم کے پیغام کو پیش کرنے کی جو روایت شیخ محمد عبدہ نے قائم کی وہ وقت کی ضرورت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بعد متعدد عرب مفسرین نے ان کے طرز کی اتباع کی۔(۶۶)

شیخ محمد عبدہ نے صرف اجتہاد، تفکر اور حریت رائے کی دعوت پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس سے آگے بڑھ کر تقلید اور اتباع پر شدید قسم کے حملے کئے۔ انہوں نے تقلید سے حاصل شدہ معلومات کو جہل اور ظلمت سے تعبیر کیا ہے اور اسے فہم قرآن کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ قرار دیا ہے۔ وہ تفسیر کے اندر نقل و روایت کے شائق مفسرین سے سخت ناراض تھے ان کی اس عادت کو انہوں نے فخر و غرور کے اظہار اور علمی تفوق کا سکہ جمانے کی خواہش کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے زمانے کے مفسرین کو بہت پر سوز انداز میں یہ نصیحت کی ہے کہ وہ ان قدیم مفسرین کے طرز کو ہرگز اختیار نہ کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ روز قامت ان سے مفسرین کے اقوال سے واقفیت سے متعلق سوال ہرگز نہیں کرے گا۔ وہ صرف یہ پوچھے گا کہ اس کی کتاب کو انہوں نے کس حد تک سمجھا؟ اس کے احکام و فرامین پر کتنا عمل کیا اور اس کے کتنے بندوں تک اس کا پیغام پیش کیا؟(۶۷)

شیخ محمد عبدہ کی تفسیر اور دیگر علمی سرمایوں میں عقلیت کے غلبہ اور تقلید سے اجتناب کی بکثرت مثالیں موجود ہیں۔ بلکہ صحیح یہ بات ہے کہ تفکر و تعقل ان کی شخصیت کا جزء لاینفک اور ان کی تفسیر کا سب سے نمایاں پہلو ہے، اس کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے ان کی عم پارہ کی مختصر ترین تفسیر کا مطالعہ کافی ہے۔ جس میں انہوں نے جنت و جہنم، نفخ صور، لوح محفوظ اور

کراما کاتبین پر جو کچھ لکھا ہے وہ قرآن کو دور جدید کے انسان کی عقل کے مطابق سمجھنے اور پیش کرنے کی کوشش ہے۔(۶۸) یہاں اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ اس کوشش میں انہوں نے تفسیری روایات اور اقوال صحابہ کے علاوہ احادیث صحیحہ کا بھی انکار کیا ہے۔ جو کسی طرح مناسب نہیں ہے۔

عربی زبان وادب اور اسلوب بلاغت

قرآن مجید چونکہ فصیح وبلیغ عربی زبان میں نازل ہوا اس لئے اس کو سمجھنے کے لیے عربی زبان پر قدرت و مہارت انتہائی ضروری ہے۔ تمام مفسرین کی طرح شیخ محمد عبدہ نے بھی عربی زبان کی اہمیت وافادیت کو تسلیم کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

" نعم ان اكثر ما ذكر من وسائل فهم القرآن ،فنون العربية لا بد منها و اصطلاحات الاصول و قواعده الخاصة بالقرآن ضرورية ايضا. كقواعد النحو و المعانى و كذالك معرفة الكون و سنن الله فيه ،كل ذالك يعين على فهم القرآن " (۶۹)

"بلا شبہ مذکورہ بالا مباحث میں سے اکثر و بیشتر فہم قرآن کے ذرائع ہیں، عربی زبان کے تمام فنون اور عربی نحو وصرف، علم المعانی وغیرہ کے اصول اور ان کی مصطلحات سے واقفیت فہم قرآن کے لئے ضروری ہے۔ اسی طرح کائنات اور اس میں کارفرما سنت الٰہی کا علم بھی ضروری ہے، یہ سب چیزیں فہم قرآن کے لئے مددگار ثابت ہوتی ہیں۔"

عربی زبان وادب کی اہمیت کے اعتراف کے باوجود شیخ محمد عبدہ نے اپنی تفسیر میں زبان و بلاغت سے متعلق مباحث کے تذکرہ میں حد سے زیادہ احتیاط سے کام لیا ہے۔ کیونکہ انکے سامنے یہ بات واضح تھی کہ ان مباحث میں ضرورت سے زیادہ الجھ کر قدیم مفسرین نے قرآن کے بنیادی مقاصد کو نظر انداز کر دیا تھا۔ یہ مقاصد ہی ان کے نزدیک سب سے زیادہ اہم ہیں اور ان کی توضیح کا عنصر تفسیر قرآن میں سب سے غالب ہونا چاہیے۔ لیکن مختلف وجوہ واسباب کی بنا پر تفسیر کی اکثر کتابوں میں یہ عنصر دب گیا ہے۔ ان میں سے ایک وجہ عربی گرامر اور بلاغت سے متعلق مسائل ہیں۔ شیخ محمد عبدہ لکھتے ہیں۔

" و من سوء حظ المسلمين ان اكثر ما كتب فى التفسير يشغل قارئه عن المقاصد العالية و الهداية السامية فمنها ما يشغله عن القرآن بمباحث الاعراب و قواعد النحو و نكت المعانى و مصطلحات البيان."(٧٠)

"یہ مسلمانوں کے لئے بہت بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ اکثر تفاسیر اپنے قارئین کو قرآن پاک کے بلند مقاصد اور ہدایت کے اعلیٰ مقام سے محروم کر دیتی ہیں۔ قرآن سے غافل کر دینے والی چیزوں میں اعراب، نحو، علم المعانی اور علم البیان کے نکات اور مصطلحات سے ضرورت سے زیادہ تعرض ہے۔"

محمد عبدہ عربی زبان وادب کو فہم قرآن کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اور تفسیر قرآن میں ان سے بقدر ضرورت کام لینے کے قائل ہیں۔ لیکن وہ یہ بات نہایت صراحت اور شدت سے بار بار دہراتے ہیں کہ ان سب چیزوں میں ان کی دلچسپی اور انہماک کا دائرہ محدود ہے۔ ان کی تفسیر میں انکے پیش نظر اصل مقصد قرآن کی روح انقلاب اور اعجاز کی وضاحت اور پیشکش ہوگی۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:۔

" ويتبعه بلا ريب :بيان وجوه البلاغة بقدر ما يحتمله المعنى و تحقيق الاعراب على الوجه الذى يليق بفصاحة القرآن و بلاغته اى عند الحاجة الى ذلك كالمسائل التى عدواها مشكلة ، وربما نشير احيانا ً الى الاعراب من غير تصريح بعبارات النحو الاصطلاحية ، كما نفعل ذلك فى بعض نكت البلاغة او قواعد الاصول حتى لا تكون الاصطلاحات شاغلاً للقارى عن المعانى وصارفة له عن العبرة"(٧١)

"اس کے بعد (یعنی قرآن مجید پر براہ راست غور و فکر اور اسکے مقاصد کی وضاحت) اقسام بلاغت کا بیان ہوگا لیکن یہ بیان بقدر گنجائش ہوگا۔ اسی طرح اعراب پر بھی گفتگو ہوگی۔ لیکن اس میں یہ امر پیش نظر رہے گا کہ یہ قرآن کی شان بلاغت کے مطابق ہو۔ گویا جب ضرورت ہوگی ہم مشکل مسائل سے تعرض کریں گے۔ ہم کبھی کبھی اعراب سے متعلق مسئلے پر بات کریں گے۔ بلاغت کے

نکات اور دیگر علوم کے اصول و مبادی کی وضاحت میں ہمارا یہی طرز عمل ہوگا۔
ہمارا مقصود یہ ہے کہ فنی اصطلاحات ہمارے قارئین کو قرآن کے مفاہیم اور
مواعظ سے غافل نہ کردیں۔"

"تفسیر قرآن کے مطلوبہ معیار" کی بحث میں یہ بتایا جاچکا ہے کہ شیخ محمد عبدہ ایک عمدہ تفسیر کے لئے پانچ شرائط کی موجودگی ضروری سمجھتے ہیں، ان میں پہلی دو کا تعلق عربی زبان ،اسلوب اور بلاغت سے ہے لیکن اہم بات یہ ہے کہ ان شرائط کو برتنے کے لئے بھی شیخ محمد عبدہ کے یہاں کچھ اصول و ضوابط ہیں۔ مفرد الفاظ کی تحقیق کے ضمن میں ان کا خیال ہے کہ مفسر کو سب سے پہلے عہد رسالت اور عہد جاہلیت کے کلام عرب کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ کیونکہ بہت سے الفاظ ایسے ہیں جو نزول قرآن کے وقت کسی اور معنی میں استعمال ہوتے تھے لیکن کچھ عرصہ کے بعد وہ دوسرے معانی میں استعمال ہونے لگے۔(۷۲) ہمارے بعض مفسرین کرام نے اس حقیقت کو نظر انداز کر کے قرآنی الفاظ کی تشریحات میں بعد کے ادوار کے استعمالات کا خیال رکھا۔ جس کی وجہ سے وہ فکر و عقیدہ کی بڑی بڑی لغزشوں سے دوچار ہوئے۔ اس لئے وہ زور دے کر کہتے ہیں کہ فہم صحیح کیلئے ناگزیر ہے کہ ملت کے اندر بعد کے زمانوں میں رائج اصطلاحات اور قرآن مجید کے استعمالات میں دوری برقرار رکھی جائے۔ انہوں نے اس کی مثال میں لفظ "تاویل" پیش کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ قرآن کے اندر اور عہد نبوی میں اس کا معنی و مفہوم اس سے مختلف تھا جو تیسری صدی ہجری میں رائج ہو گیا۔ الفاظ کی تحقیق کے ضمن میں دوسری اہم رہنمائی انہوں نے یہ کی کہ جو الفاظ قرآن میں متعدد جگہوں پر استعمال ہوئے ان کو جمع کرنا چاہیے اور پھر اس کے معانی پر غور کرنا چاہیے۔ بسا اوقات اسے معلوم ہوگا کہ ایک لفظ خود قرآن مجید کے اندر کئی مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے۔ ایسی شکل میں اس سے معنی مراد کے تعین میں آیت کے سیاق و سباق سے مدد ملے گی۔ اس کی مثال انہوں نے لفظ ہدایت سے دی ہے اور سورہ فاتحہ کی تفسیر میں اس پر گفتگو کر کے عملی رہنمائی بھی فراہم کردی ہے۔(۷۳)

اسلوب اور بلاغت سے متعلق انکا خیال ہے کہ ایک مفسر کو ان فنون کے اصول و مبادی اور ان کی باریکیوں سے واقفیت ہونی چاہیے۔ یہ واقفیت فصیح و بلیغ عربی کلام کے مسلسل مطالعہ،

مشق و ممارست، زبان و بیان کے محاسن پر نظر اور معنی مراد سے آگہی سے شدید رغبت کے بعد حاصل ہو سکتی ہے۔ اگر یہ استعداد بہم پہنچالی جائے تو اللہ تعالیٰ کے اعلیٰ وارفع کلام کے ہر پہلو کو سمجھنے کا دعویٰ تو نہیں کیا جاسکتا، لیکن بقدر استطاعت اور حسب لیاقت فہم کی مشکلات آسان ہوتی جائیں گی۔ شیخ محمد عبدہ نے اسلوب و بلاغت کے ذیل میں ایک انتہائی اہم اور نکتے کی بات یہ کہی ہے کہ ان دونوں میں اچھی استعداد کا حصول کتابوں کے مطالعہ اور ان سے استفادہ کے علاوہ آدمی کے اپنے ذوق اور ملکہ پر منحصر ہے۔(۷۴) کیونکہ عہد نبوت میں علوم و فنون کی تدوین کے نہ ہونے کی وجہ سے لوگ ان کی اصطلاحات اور اصول و مبادی سے واقف نہیں تھے۔ لیکن وہ زبان کا اتنا اچھا ذوق رکھتے تھے کہ قرآن جیسے فصیح و بلیغ کلام کی سماعت ہی ان کے دلوں پر جادو کی طرح اثر کرتی تھی۔ سیرت سرور عالمؐ کا مطالعہ کیجئے تو کتنے ہی ایسے واقعات ملیں گے کہ عرب بدوؤں نے قرآن حکیم کی آیات سنی اور فوراً ایمان لائے۔ اس سلسلے میں شیخ محمد عبدہ نے ایک عرب دیہاتی لڑکی کا واقعہ بیان کیا جسے مشہور امام لغت الاصمعی نے کچھ اشعار گنگناتے ہوئے پایا تو اس کی فصاحت و بلاغت کی داد دی، اس لڑکی نے فوراً اس کے جواب میں قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت کا حوالہ دیا اور یہ کہا کہ اس سے بہتر کلام کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اس نے بطور استشہاد یہ آیت پڑھی۔(۷۵) "و اوحینا الی ام موسیٰ ان ارضعیه فاذاخفت علیه فالقیه فی الیم و لاتخافی ولا تحزنی ، انا رادوه الیك و جاعلوه من المرسلین" (۲۷:۷)

شیخ محمد عبدہ نے اپنی تفسیر میں عربی زبان و ادب سے متعلق مباحث میں اس امر کا خصوصی خیال رکھا ہے کہ قرآن کی عظمت اور وقار پر کوئی حرف نہ آئے۔ گویا قرآن مجید کو اصل کی حیثیت حاصل ہو اور دیگر علوم و فنون اس کے تابع ہوں، انہوں نے تفسیر کے اندر متعدد مقامات پر ان مفسرین کی سخت گرفت کی ہے، جو لغت و بلاغت کے مقررہ اصولوں کی روشنی میں قرآنی آیات کا جائزہ لیتے ہیں اور قرآن کو ان کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اس راہ میں اگر انہیں کوئی دشواری پیش آتی ہے تو اسے ضرورت قافیہ یا تقاضائے تاکید وغیرہ کا نام دے کر ٹالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شیخ محمد عبدہ نے اس طرح کے مفسرین کی سرزنش کی ہے اور یہ اصولی موقف پیش کیا ہے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے۔ وہ

ہر چیز پر قادر ہے۔ ضرورت قافیہ، فاصلہ یا تاکید محض کا وجود اور ان کی رعایت انسانوں کے کلام میں ممکن ہے۔ خدا کے کلام میں ہرگز اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس کا ہر لفظ انتہائی موزوں ہے اور اس میں زبان و بیان کی تمام تر رعنائیاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ان کے ادراک کے لئے عقل سلیم اور ذوق لطیف کی ضرورت ہے،(۷۶)۔ شیخ محمد عبدہ کے اس موقف کی تفصیلات سورہ فاتحہ کی آیت " الرحمن الرحیم "(۷۷) اور سورہ بقرہ کی آیت "ان اللہ بالناس لرؤف رحیم "میں موجود ہیں۔(۷۸)

تفسیری روایات

کتب تفسیر کا مطالعہ کرنے والے اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ ان کے اندر روایات کا ایک بڑا حصہ موجود ہے۔ یہ روایات زیادہ تر ان قصص و حکایات اور تاریخی مقامات سے متعلق ہیں جو انبیاء کرام یا سابقہ کتب کے تذکرہ کے ضمن میں قرآن حکیم میں مفصل یا مجمل طور سے موجود ہیں۔ ان کے علاوہ ایسی روایات کی تعداد بھی کچھ کم نہیں جن کے ذریعہ چند اشخاص یا مذہبی گروہوں نے اپنے مذہبی یا مسلکی خیالات کی تائید کی ہے۔ مزید یہ کہ آیت متشابہات کی تاویل اور قرآن کے مجمل بیانات کی توضیح کی بے جا خواہش نے بھی بعض مفسرین کو مفروضہ اور بے بنیاد روایات سے مدد لینے کے لئے راغب کیا۔ شیخ محمد عبدہ چونکہ تدبر و تفکر، حریت رائے اور اجتہاد کے علمبردار اور تقلید و اتباع کے مخالف تھے اس لئے انہوں نے اس طرح کی تمام کوششوں پر اظہار نکیر کیا ہے اور انہیں تسلیم کرنے یا ان سے استدلال کرنے سے صاف لفظوں میں منع کر دیا ہے۔ انہوں نے ان روایات کے پرکھنے کا ذریعہ بھی قرآنی تعلیمات کی روح سے ہم آہنگ عقل و فکر کو بتایا ہے۔ جو ان کے نزدیک دین میں خرافات و اوہام کی آمیزش کو قبول نہیں کر سکتی۔(۷۹)

یوں تو محمد عبدہ نے ہر طرح کی کمزور اور بے بنیاد روایات کی تردید کی ہے لیکن مقدار میں زیادہ ہونے کے سبب ان کی تنقید کا نشانہ سب سے زیادہ وہ روایات بنی ہیں جنہیں اسرائیلیات کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ روایات زیادہ تر یہود و نصاریٰ اور ایران کے ملحدین کے ذریعہ نقل ہو کر آئی ہیں۔ اور تفصیل و اطناب کے دلدادہ مفسرین نے انہیں بغیر کسی تحقیق کے اپنی تفاسیر میں داخل کر لیا۔ شیخ محمد عبدہ نے اپنی تفسیر میں اس طرح کی روایات پر کوئی

توجہ نہیں دی ہے اور ان سے مکمل اجتناب کیا ہے۔(۸۰)

ان کی تفسیر کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ وہ تمام مقامات جہاں بیشتر مفسرین نے کئی کئی صفحات لکھ ڈالے ہیں، محمد عبدہ صرف چند سطور میں بعض اصولی باتیں کہہ کر گزر گئے ہیں۔ چنانچہ سورہ بقرہ کی آیت "واذ قلنا ادخلوا هذه القرية فكلوا منها حيث شئتم" میں انہوں نے گاؤں کی صراحت سے بالکل احتراز کیا ہے۔(۸۱) اسی طرح وہ آیت "فانزلنا على الذين ظلموا رجزا من السماء" کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"نسكت عن تعيين الرجز كما هو شأننا فى كل ما أبهمه القرآن"(۸۲)

"ہم "رجز" کی تعیین پر خاموشی اختیار کریں گے۔ ہمارا تمام مبہمات قرآن کے بارے میں یہی موقف ہے" اسی طرح سورہ البروج اور سورہ الفجر میں "اصحاب اخدود" اور "عاد ارم ذات العماد" کی تفسیر بیان کرتے ہوئے انہوں نے روایات سے بالکل تعرض نہیں کیا بلکہ اس کے علی الرغم ان پر تنقید کی ہے اور ایک اصولی موقف پیش کیا ہے۔(۸۳)

شیخ محمد عبدہ نے یہی موقف ان مفسرین کے بارے میں بھی اختیار کیا جنہوں نے شخصی اور مسلکی میلانات و رجحانات کے تحت قرآنی آیات کی من مانی تاویلیں کی ہیں اور اپنے مسلک کی حمایت میں ضعیف اور کمزور روایتوں کا سہارا لیا ہے۔ محمد عبدہ کے نزدیک شفاعت، زیارت قبور اور تکریم اہل بیت وغیرہ سے متعلق روایات اسی زمرہ میں داخل ہیں اور اس لائق نہیں ہیں کہ ان کی طرف توجہ دی جائے۔(۸۴)

انہوں نے آیات متشابہات کے بارے میں بھی حزم و احتیاط اور توقف کا موقف اختیار کیا۔ چنانچہ سورہ عبس کی آیت "وفاكهة و ابا" کے ضمن میں حضرت عمرؓ کا ایک قول نقل کر کے اس کی تشریح کی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ کتاب کے اندر جو کچھ ہے اس کی تلاش و جستجو ہونی چاہیے اور اس سے باہر کی چیزوں کے چکر میں پڑنے سے احتیاط کرنی چاہیے۔ بحیثیت مومن ہماری یہی ذمہ داری ہے کہ ہم قرآن کو سمجھیں۔(۸۵)

شیخ محمد عبدہ نے حروف مقطعات کے بارے میں بھی یہی موقف اختیار کیا۔ وہ انہیں ان سورتوں کے نام قرار دیتے ہیں جن کے شروع میں یہ آئے ہیں۔ اس کے بعد وہ ان کی مزید تحقیق کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ کیونکہ اس میں لغزش کا امکان ہوتا ہے۔ ان

کے خیال میں صحابہ کرام کا بھی یہی موقف تھا۔(۸۶)

اسرائیلی روایات ہوں یا آیات متشابہات کے متعلق تاویلات ہوں یا ان دونوں کے علاوہ فلاسفہ، متکلمین، صوفیاء، فقہاء اور دیگر مذہبی جماعتوں کے استنباطات اور تخریجات ہوں، شیخ محمد عبدہ کا ان سب کے بارے میں مشترک خیال یہ ہے کہ یہ فہم قرآن کے تئیں جرأت بیجا اور تکلیف مالا یطاق ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو ہدایت کے اعتبار سے مکمل شکل میں اتارا ہے۔ اس کو سمجھنے کے لئے اس کی اپنی توضیحات کافی ہیں، اس لئے مفسرین کرام کو کتاب الٰہی اور سنت نبوی پر اکتفا کرنا چاہیے تھا، اس کے مجمل اور متشابہ مقامات سے متعلق جزئیات کی تلاش میں سرگرداں نہیں ہونا چاہیے تھا۔ کیونکہ قرآن مجید نے انہیں اس کی ہدایت نہیں کی تھی اور نہ ہی یہ کتاب اللہ کے منشا کے مطابق تھا۔ اگر یہ تفصیلات قرآن مجید کی شان اور پیغام سے مطابقت رکھتیں تو سب سے پہلے خود قرآن میں مذکور ہوتیں۔ ورنہ کم از کم رسول کریم ان پر روشنی ڈالتے کیونکہ وہ شارح قرآن بھی تھے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے مفسرین کی روایات سے دلچسپی اور انہماک کا محرک کتاب اللہ کی خدمت نہیں بلکہ ان کی اپنی پسند اور ترجیحات تھیں۔ جنکی تکمیل کے لئے انہوں نے غیب پر دست درازی کی، بے بنیاد روایات کا سہارا لیا حتی کہ وضع حدیث اور اسلاف کی طرف بے بنیاد باتوں کے انتساب کا جرم عظیم بھی کیا۔ (۸۷)

روایات کے بارے میں شیخ محمد عبدہ کے مذکورہ بالا سخت اور بے لچک موقف کی سب سے بڑی وجہ ان کا یہ خیال تھا کہ ان روایات سے قرآن حکیم کی صاف ستھری تعلیمات کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا اور یہ روایات فہم قرآن کی راہ میں حجاب بن گئیں۔ چنانچہ تفسیر المنار کے مقدمہ میں وہ لکھتے ہیں:۔

> (ترجمہ)" فلاسفہ اور متکلمین کے مجادلات، فقہاء اور علماء اصولیین کی تخریجات، صوفیاء اور علماء باطن کی تاویلات اور مذہبی و مسلکی فرقوں کے تعصبات اور باہمی اختلافات نے قرآن کریم کے پیغام اور دعوت سے لوگوں کو غافل کر دیا، پھر روایات کی کثرت اور اسرائیلی خرافات نے اس غفلت کو اور بڑھاوا دیا۔ امام رازی نے ایک نیا شوشہ چھوڑا۔ انہوں نے اپنی

تفسیر میں وہ تمام نئے علوم جیسے ریاضی، طبعیات، ہیئت اور فلکیات وغیرہ داخل کردئے جن سے عہد نزول کے وقت عرب معاشرہ بالکل ناواقف تھا۔ نتیجۃً یہ سب چیزیں فہم قرآن کے لئے رکاوٹ بن گئیں۔"(۸۸)

روایات کی طرح آیات متشابہات کے بارے میں بھی انہوں نے اپنے سخت موقف کی تائید میں مضبوط دلائل دئے ہیں۔ جن کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کی متشابہ اور مجمل آیات سے متعلق کتب تفسیر کے اندر موجود تفصیلات غیر ضروری اور بے بنیاد ہیں۔ ہم اس کے مکلف نہیں۔ اس لئے ان سے اجتناب کرنا چاہیے۔ ہمیں اس بات پر ایمان لانا چاہیئے کہ ان کا صحیح علم اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے اگر وہ چاہتا تو ہمیں ضرور ان تفصیلات سے آگاہ کرتا۔(۸۹)

احادیث صحیحہ اور محمد عبدہ

تفسیر قرآن میں روایات کا ایک حصہ احادیث نبوی، اقوال صحابہ اور اقوال تابعین پر مشتمل ہے۔ شیخ محمد عبدہ انہیں قبول کرنے میں بھی حزم و احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ انکے شاگرد علامہ رشید رضا نے مقدمہ تفسیر المنار میں احادیث کے بارے میں انکے موقف کی وضاحت کی ہے اور یہ بتلایا ہے کہ ان کا موقف علامہ ابن تیمیہ اور امام احمد بن حنبل کے موقف سے قریب ہے۔ ان کی طویل بحث کا خلاصہ سطور ذیل میں پیش کیا جارہا ہے:۔

"نبی کریمؐ، صحابہ کرام اور تابعین عظام سے جو روایات نقل کی جاتی ہیں وہ ہمارے نزدیک بہت اہم ہیں۔ ہم ان کی صحت کی تصدیق کے بعد ان سے استدلال کریں گے، خاص طور سے وہ روایات جن میں ہدایت و موعظت کے عمدہ نکات بیان کئے گئے ہیں۔ اور عہد نزول قرآن کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ وہ ہمارے بہت کام کی ہیں۔ لیکن ان روایات سے متعلق ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ ان میں سے بہت سی موضوع ہیں۔ اور یہود و نصاریٰ اور مجوسیوں کی سازشوں کے نتیجہ میں ذخیرہ تفسیر میں داخل ہوگئی ہیں۔ ظاہر ہے ان روایات کو ہم قبول نہیں کرسکتے اس باب میں ہم امام ابن تیمیہ اور احمد بن حنبل کے خیالات کی تائید کرتے ہیں۔

امام ابن تیمیہ نے تفسیری روایات کے اختلاف وغیرہ پر بحث کرنے کے

بعد یہ لکھا ہے کہ وہ صرف صحیح احادیث کو قبول کرنے کے حق میں ہیں ۔ اسرائیلی روایات کے سلسلے میں وہ احتیاط کے قائل ہیں۔ تابعین اور تبع تابعین کے اقوال کے سلسلے میں بھی وہ توقف سے کام لیں گے۔ ان کے بالمقابل صحابہ کرام کی طرف منسوب اقوال کو وہ غور سے دیکھیں گے اور نبی کریم سے براہ راست استفادہ کے امکان سے وہ انہیں قبول بھی کرلیں گے۔ امام ابن تیمیہ کے علاوہ امام احمد بن حنبل بھی روایات کے سلسلے میں ہمارے موقف کی تائید کی ہے۔ وہ فرمایا کرتے تھے۔ "تین چیزوں کی کوئی اصل نہیں ، تفسیر، ملاحم اور مغازی"۔

"مذکورہ بالا دونوں جلیل القدر علماء اسرائیلی روایات کی تردید اور ان سے عدم استدلال پر متفق ہیں خواہ وہ روایات جیسا کہ علامہ ابن تیمیہ کے بیان میں صراحت ہے کہ کعب الاحبار اور وھب بن منبہ جیسے ثقہ حضرات سے مروی ہوں۔ تابعین کی روایتوں کے بارے میں بھی ابن تیمیہ جیسے عالم توقف اختیار کرتے ہیں۔ اور صحابہ کرام کی روایات کو بھی یکلخت قبول نہیں کرتے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ تابعین کے بالمقابل صحابہ کے اقوال کی قبولیت کی طرف زیادہ مائل ہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض علماء کی یہ رائے کہ صحابہ کرام کی مرویات کا حکم حدیث مرفوع کا ہے اور انہیں بلا تحقیق تسلیم کرنا چاہیے، محل نظر ہے۔"(۹۰)

شیخ محمد عبدہ کے تفسیری افکار پر ایک نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر وہ چیز جو فہم قرآن کی راہ میں مانع ہو ان کے نزدیک نا قابل اعتناء ہے۔ وہ مقدمہ المنار میں لکھتے ہیں:۔

(وغرضنا من هذا كله ان اكثر ما روى فى التفسير المأثور او كثيره' حجاب على القرآن و شاغل لتاليه عن مقاصده العالية المزكية للانفس المنورة للعقول.)"

"ان سب تفصیلات کے بیان کرنے سے مقصود یہ بتانا ہے کہ تفسیر ماثور کا اکثر و بیشتر حصہ قرآن کے لئے حجاب ہے اور اس کی تلاوت کرنے والے کو

ان بلند مقاصد سے غافل کر دیتا ہے جن سے نفس کو تزکیہ اور عقل کو روشنی حاصل ہوتی ہے۔"(۹۱)

انہوں نے حدیث کے بارے میں اپنے مذکورہ موقف کا اظہار ان آیات کی تفسیر کے ذیل میں خاص طور سے کیا ہے۔ جن کے زمانہ نزول کے حوالہ سے بکثرت روایات کتب تفسیر میں موجود ہیں۔ چنانچہ سورہ الکوثر میں "کوثر" سے اکثر مفسرین نے جنت کی ایک نہر مراد لیا ہے۔ اور اس کی تائید میں احادیث پیش کی ہیں۔ شیخ محمد عبدہ اس سے رسالت مراد لیتے ہیں جس کا فیضان تا قیامت جاری رہے گا۔ پھر انہوں نے متعلقہ احادیث پر گفتگو کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ کثرت کے باوجود یہ احادیث تواتر کی شرط پر پوری نہیں اترتیں۔ دوسری طرف چونکہ ان روایات میں نبی کریمؐ کے غیر معمولی اعزاز و اکرام کی بات کی گئی ہے اس لئے ہمارے محدثین اور مفسرین نے عقیدت کے غلبہ کی وجہ سے ان کی صحت پر بہت زیادہ کلام نہیں کیا اور یہ چیز تواتر کے لئے مانع ہے کیونکہ اس کی ایک اہم شرط رواۃ کا طرفداری اور تعصب سے پاک ہونا ہے۔(۹۲)

اسی طرح انہوں نے تفسیر "الفلق" میں سحر سے متعلق تمام روایات کو رد کر دیا ہے اور انہیں شان نبوت کے منافی قرار دیا ہے۔ انہوں نے اس بات پر تعجب کا اظہار کیا کہ جس سحر کی قرآن کریم نے ایک سے زائد آیات میں تردید کی ہے، ہمارے مفسرین نے اس سورہ میں روایات پر انحصار کر کے حضور کریمؐ کی ذات گرامی پر اس سحر کے اثرات کے وقوع پزیر ہونے کی تصدیق کر دی۔ یہ نبی آخر الزماں پر کھلا ہوا الزام ہے اور ان کی معصومیت کے خلاف ایک چیلنج ہے۔ اس لئے بخاری جیسی صحیح کتاب میں سحر سے متعلق ان روایات کی موجودگی کے باوجود انھوں نے ان کی صداقت اور صحت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کے نزدیک آیت "من شر غاسق اذا وقب و من شر النفاثات فی العقد" سے مراد چغل خور اور تعلقات کو خراب کرنے والے لوگ ہیں۔ گویا انہوں نے الفاظ کی روشنی میں ان آیات کا معنی متعین کیا اور روایات سے کوئی سروکار نہیں رکھا۔(۹۳)

تفسیر سورہ الفلق میں سحر سے متعلق روایات کا انکار کرتے ہوئے انہوں نے بعض ایسی باتیں کہی ہیں جو انتہائی اہم اور اصولی نوعیت کی ہیں اور جن کی مدد سے ہمیں حدیث کے

بارے میں ان کے موقف کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے وہ لکھتے ہیں:

"یہ ایک واجب التسلیم حقیقت ہے کہ قرآن کریم میں بیان کردہ حقائق قطعی اور حتمی ہیں۔ یہ کتاب نبی کریم سے بتواتر منقول ہے جس بات کو یہ کتاب تسلیم کرے وہ واجب الاعتقاد ہے اور جس کی نفی کرے اس کا انکار لازم ہے۔ یہ بات ہم سب کو معلوم ہے کہ قرآن کریم نے نبی معصومؐ سے سحر کی نفی کی ہے اور کفار کے اس قول پر کہ "آپ مسحور ہیں" اس نے گرفت کی ہے اور بُرے انجام سے آگاہ کیا ہے۔ اب اگر کسی حدیث میں اس سحر کے آپ کی ذات پر اثرات اور اس کی موجودگی کا تذکرہ اور اثبات ہو تو ہم اس حدیث یا احادیث کو کیسے صحیح مان لیں؟ اس لئے کہ ہمارا یہ موقف ہے کہ عقائد کے باب میں اخبار آحاد سے احتجاج نہیں کیا جاسکتا۔ اس اصول کی روشنی میں مذکورہ حدیث صحیح ہونے کے باوجود ناقابل احتجاج ہے۔ چونکہ نبی کریم کا سحر کی تاثیر سے محفوظ رہنا اسلامی عقائد میں سے ایک ضروری عقیدہ ہے اس لئے اس ضمن میں ظنی دلیل کافی نہیں۔ مزید براں خبر واحد سے ظنی علم اس وقت حاصل ہوتا ہے جب اس کی صحت ثابت ہو جائے۔ غیر صحیح ہونے کی صورت میں تو خبر واحد مفید ظن بھی نہیں ہوتی۔" (۹۴)

مذکورہ بالا مباحث اور بعض دوسرے حوالوں کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ شیخ محمد عبدہ کے نزدیک "قرآن کی تفسیر قرآن کے استعمالات اور عقل سلیم کی روشنی میں کی جائے" قرآن فہمی کا رہنما اصول ہے اس کے بعد صحیح احادیث کا نمبر ہے۔ لیکن وہ صرف ان ہی روایات کو قبول کرتے ہیں جو سند کے لحاظ سے صحیح ہونے کے علاوہ قرآن اور اسلام کی بنیادی تعلیمات اور تصورات سے مطابقت رکھتی ہوں۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ قرآن کی حیثیت خبر قطعی اور متواتر کی ہے جبکہ احادیث کی حیثیت خبر ظنی اور غیر متواتر کی ہے۔ اس لئے خبر قطعی اور متواتر کو خبر ظنی اور غیر متواتر پر ترجیح نہیں دی جاسکتی۔ یہاں اس امر کی وضاحت بھی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ شیخ محمد عبدہ کے یہاں تواتر کی شرط صرف قرآن کے

باب میں پوری ہوئی ہے۔اور کوئی حدیث اس شرط کو پورا نہیں کرتی۔(۹۵)

اخلاقی اور معاشرتی مسائل

شیخ محمد عبدہ ایک ممتاز مفکر اور عظیم مصلح تھے۔وہ مصر اور عالم اسلام کی اخلاقی و معاشرتی زبوں حالی پر انتہائی ملول اور اسے اس حالت زار سے نجات دلانے کے لے کوشاں و سرگرداں تھے۔اس مقصد کے لئے انہوں نے ملک و ملت کے حالات کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور اپنی معلومات میں وسعت اور کوششوں کو بامراد بنانے کیلئے یورپ کا سفر بھی کیا تھا اور اسلامی لٹریچر کے علاوہ مغربی مصنفین کی تالیفات سے استفادہ کیا تھا۔ان تمام کاوشوں کا مقصود اور محرک اصلاح و تجدید کے مشن کو کامیابی سے ہمکنار کرنا تھا کیونکہ یہ مشن انہیں ان کی زندگی سے زیادہ عزیز تھا۔(۹۶) ظاہر ہے ایسا شخص فطری طور سے اپنی بات کو دوسروں تک منتقل کرنے کے لیے ہمہ آن بے چین رہتا ہے اور اس کیلئے کوئی مناسب موقعہ ضائع کرنا ناممکن ہوتا ہے۔ شیخ محمد عبدہ کا یہی حال تھا۔اس کی تائید و تصدیق کے لئے ان کی تفسیر کا مطالعہ کافی ہے۔(۹۷)

نزول قرآن مجید کی ایک اہم غرض و غایت انسان کا تزکیہ اور معاشرہ کی صحیح خطوط کے مطابق تعمیر و تشکیل تھی۔اس مقصد کے تحت قرآن پاک میں اخلاقی اصول و ضوابط اور معاشرتی اقدار و اساسیات کا جامع تعارف پیش کیا گیا اور فرد و معاشرہ کو ان کی تعمیل اور ان سے آراستہ ہونے کی ہدایت کی گئی ہے۔قرآن نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس سے آگے بڑھ کر تاریخ انسانی سے مختلف اقوام اور اشخاص کی مثالیں پیش کر کے تزکیہ و تربیت کے عمل سے گزرنے کی ترغیب دلائی ہے اور انحراف کی شکل میں انجام بد سے دوچار ہونے کی وعید سنائی۔(۹۸)

شیخ محمد عبدہ قرآن مجید کے اندر اصلاح و تربیت سے متعلق آیات پر کچھ دیر ضرور ٹھہرتے اور ان کی وضاحت قدرے تفصیل سے کرتے تھے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے وہ موقع کی تلاش میں تھے اور اسے پالینے کے بعد اسے ضائع کرنا بڑی حرماں نصیبی تصور کرتے تھے۔شیخ کا معمول تھا کہ وہ متعلقہ آیات کے مفہوم و مدعا کی وضاحت کے ساتھ امت مسلمہ پر ان کے انطباق اور اس کی روشنی میں امت کے احوال کا جائزہ اور مناسب رہنمائی کا کام بھی کرتے تھے۔اس لئے اخلاقی و معاشرتی امراض کی تشخیص اور علاج کے تعین کے ضمن میں ان کی تفسیر کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔(۹۹) اس کا اصل اندازہ تو ان کی تفسیر کے مطالعہ

سے ہو گا لیکن یہاں چند مثالیں بطور نمونہ پیش کی جا رہی ہیں۔

سورہ " و العصر " کی آیت " وتواصوا بالصبر " کی تفسیر میں انہوں نے سب سے پہلے صبر کا معنی بتایا ہے۔ اس کے بعد مسلم معاشرہ کے زوال اور بدحالی کا ذکر کرتے ہوئے اس کا اصل سبب صبر کا فقدان قرار دیا ہے، اور یہ زور دیکر کہا ہے کہ اگر مسلم عوام اور مسلم سماج اپنی اصلاح کا متمنی ہے اور ترقی کی راہ پر چلنے کا خواہاں ہے تو اسے اخلاق عالیہ کے سر چشمہ "صبر" سے متصف ہونا ہو گا۔ اس ضمن میں انہوں نے علماء کرام اور اساتذہ و طلبہ کی ذمہ داریاں یاد دلائیں اور انہیں ان ذرائع و وسائل کی تحصیل اور استعمال کے لئے آمادہ کیا جو ادائیگی فرض کیلئے ضروری ہیں (۱۰۰)

اسی طرح انہوں نے سورہ " الانفطار " کی آیت " إن الابرار لفی نعیم " کی تشریح بھی بہت تفصیل سے کی ہے۔ ان کے نزدیک نیکوکار وہ شخص ہے جس کی شخصیت اور مال و دولت سے دوسروں کو فائدہ پہنچے۔ اس کے برعکس وہ شخص جو عبادات کا پابند ہو لیکن اس کی شخصیت اور دولت سے دوسروں کو فائدہ نہ پہنچ رہا ہو وہ نیکوکار نہیں بلکہ اس بات کا اندیشہ ہے کہ بعض حالات میں اس کا شمار فجار میں نہ ہو جائے۔ (۱۰۱)

چنانچہ وہ سورہ " الماعون " کی آیت " ولا یحض علی طعام المسکین " کی تشریح میں لکھتے ہیں کہ اس آیت میں دین دار لوگوں کو فقیروں اور محتاجوں کی اعانت پر ابھارا گیا ہے۔ خواہ یہ اعانت دوسروں سے چندہ جمع کر کے کی جائے جیسا کہ رفاہی اور فلاحی انجمنوں کا طریقہ کار ہے۔ اس طرح کی تمام کوششوں کی بنیاد قرآن حکیم کی اس آیت میں موجود ہے۔ (۱۰۲)

شیخ محمد عبدہ کی تفسیر میں اس طرح کی بکثرت مثالیں موجود ہیں بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ ان کی تفسیر کا بہت نمایاں پہلو ہے۔ اس کا اعتراف ان تمام لوگوں نے کیا ہے جو ان کی فکر سے آگاہ تھے اور ان کی تصانیف سے مستفید ہوئے تھے۔ ڈاکٹر محمد بن لطفی الصباغ لکھتے ہیں:۔

"نهج فی تفسیره منهجا ادبیا اجتماعیا فکان یکشف عن بلاغة القرآن باسلوب مشرق جذاب و یعالج مشاکل المسلمین بما یرشد الیه القرآن و یتعرض الی سنن الله الکونیة فیبینها و یبین ان القرآن متمش مع هذه السنن لا یصادمها لانها من مستلزمات

الفطرة" (۱۰۳)

انہوں نے اپنی تفسیر میں ایک ادبی اور معاشرتی نہج اختیار کیا تھا چنانچہ وہ قرآن کی فصاحت و بلاغت کو انتہائی دلکش اور جاذب نظر اسلوب میں پیش کرتے تھے اور قرآن کی ہدایت کے مطابق مسلمانوں کے مسائل کا حل پیش کرتے تھے۔ وہ کائنات میں کارفرما اللہ تعالیٰ کے قوانین اور سنت کا حوالہ دیتے تھے۔ اور انکی تشریح کرتے تھے۔ نیز یہ بتاتے تھے کہ قرآن ان قوانین فطرت سے ہم آہنگ ہے۔ اس کا ان سے کوئی تصادم نہیں۔

ڈاکٹر محمد عثمان امین نے جو شیخ محمد عبدہ کی شخصیت اور فکر کے ایک بڑے شارح تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اس موضوع پر ایک عمدہ بحث کی ہے۔ اس کی آخری سطور کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

"ہمارے نزدیک ان کی تفسیر کا ایک نادر وصف یہ ہے کہ وہ مصری معاشرے کی اصلاح کا ایک موثر ذریعہ ہے۔ یہ تفسیر خالص اخلاقی روح سے مملو اور اسی کے ساتھ عصری مذاق اور اس کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہے"۔ (۱۰۴)

جدید علمی اور سائنسی نظریات

شیخ محمد عبدہ نے قرآن مجید کی بعض آیات کی تشریح سائنس کے جدید نظریات کی روشنی میں کی ہے۔ دراصل وہ قرآن مجید کو علوم و فنون کا خزانہ اور سرچشمہ سمجھتے ہیں۔ اور یہ یقین رکھتے ہیں کہ انسان علمی و فکری اعتبار سے خواہ کتنا ہی ترقی یافتہ ہو جائے، قرآن پاک کی ہدایت سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ دوسرے الفاظ میں اسے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ان کے نزدیک قرآن مجید جدید سائنسی علوم اور ترقیات سے متصادم نہیں بلکہ ان کا حامی اور معاون ہے۔ (۱۰۵) اگر قرآن پاک میں کسی جگہ جدید علوم سے ٹکراؤ یا تصادم نظر آتا ہے تو اس میں اس کا قصور نہیں بلکہ اس فرد کی نگاہ کا قصور ہے جو فہم قرآن کا خواہاں ہے۔

شیخ محمد عبدہ نے اپنی تفسیر میں مذکورہ بالا اصول کو پیش نظر رکھا ہے۔ اس کے تحت انہوں نے ایک طرف قرآن مجید کی بعض آیات کی تشریح جدید معلومات کی روشنی میں کی ہے تو دوسری طرف بعض ایسی آیات کی نئی تاویل پیش کی ہے جن کی تفہیم عصر حاضر کے عقلیت پسند انسان کے لئے مشکل ہو رہی تھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کی طرف سے

اس طرح کی تمام کوششیں نیک نیتی اور اخلاص پر مبنی تھیں۔ وہ قرآن مجید کو متعارف اور اس کی دعوت کو عام کرنا چاہتے تھے۔ وہ اپنے مقصد میں کس قدر کامیاب ہوئے اس کا صحیح اندازہ ان کے مجموعہ تفاسیر کے مطالعہ کے بعد ہی کیا جاسکتا ہے۔ (۱۰۶) یہاں ان کے نہج تفسیر کی وضاحت کے لئے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

وہ " واذا السماء انشقت " کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہی کہ انشقاق کے معنی پھٹ جانے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اس دنیا کو ختم کرنا چاہے گا تو سب سے پہلے آسمان پھٹ جائے گا اور اس میں جو ترکیب پائی جاتی ہے وہ باقی نہ رہے گی۔ اس کا پورا نظام بکھر جائے گا۔ یہ صورت کسی عظیم حادثہ کے رونما ہونے سے بھی پیش آسکتی ہے۔ مثلاً ایک سیارہ چلتے چلتے دوسرے سیارہ کے قریب پہنچ جائے اور اس طرح دونوں کا تصادم ہو جائے۔ اس کے نتیجہ میں سورج کا نظام درہم برہم ہو جائیگا اور فضا میں چاروں طرف مختلف ٹکڑیوں میں بادل چھا جائے گا۔ اس کے بعد آسمان کا نظام بھی باقی نہ رہے گا۔ (۱۰۷)

سورہ فیل کی آیت " وارسل علیھم طیرا ابابیل " کی تفسیر میں وہ کہتے ہیں کہ اصحاب فیل کی ھلاکت کا سبب چیچک کا مرض تھا اور یہ بیماری ان سنگ ریزوں کے ذریعہ پھیلی تھی جنہیں مکھی یا مچھر کے قبیل کے پرندوں نے لشکر پر پھینکا تھا۔ گویا پتھر یا مٹی کے ان ذرات میں بعض امراض مثلاً چیچک، خسرہ وغیرہ کے جراثیم تھے، انہوں نے اپنی رائے کی تائید میں عکرمہ اور یعقوب بن عتبہ کی وہ رویت بھی پیش کی ہے جس میں صراحت ہے کہ عربوں نے چیچک اور خسرہ کی بیماری کا سب سے پہلا مشاہدہ " عام الفیل " میں کیا تھا۔ (۱۰۸)

اسی طرح سورہ بقرہ کی آیت " او کصیب من السماء فیہ ظلمات و رعد و برق " کی تشریح میں انہوں نے بہت سی جدید سائنسی ایجادات مثلاً ٹیلیفون اور ٹیلیگرام وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے۔ اور اس امر پر تعجب کا اظہار کیا ہے کہ مسلمان ان سے تبلیغ کا کام نہیں لیتے۔ (۱۰۹)

جدید نظریات سے استفادہ اور غور فکر کی صلاحیت کے آزادانہ استعمال کی حوصلہ افزائی کی ایک مثال سورہ بقرہ کی آیت " واذا قلنا للملائکۃ اسجدوا لآدم فسجدو ا الا ابلیس " کی تفسیر میں بعض مفسرین کی ایک رائے کے تذکرہ اور اس کی خاموش حمایت میں ملتی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس میں " ملائکہ " سے مراد وہ تمام روحانی قوتیں ہیں جو اس دنیا کے اندر

موجود مخلوقات کے اندر الگ الگ ودیعت کی گئی ہیں اور جن پر اس دنیا کا نظام قائم ہے۔ اور آدم سے مراد ایک ایسی نسل کی تخلیق ہے جو تمام مخلوقات سے برتر ہو گی اور سجدہ کرنے سے مراد ان ارواح و قویٰ کو اس نئی قوت اور مخلوق کے سامنے سرنگوں ہونے اور اسکی تابعداری کرنے کا فیصلہ ہے۔ جس کے مطابق تیار ہونے والی نئی مخلوق پہلے سے موجود تمام مخلوقات کو مسخر کرے گی اور ان کی قوتوں اور صلاحیتوں سے زمین کی تعمیر و ترقی کا کام لے گی اور ابلیس کے سجدہ نہ کرنے سے مراد کائنات میں موجود ایک قوت کی عدم تسخیر کی طرف اشارہ ہے۔ یہ قوت اس کائنات کا جزو لاینفک ہے۔ یہ وہ قوت ہے جو کامل کو ناقص اور ہدایت یافتہ کو گمراہ کر دیتی ہے۔ یہی قوت ہے جو انسان کو اس کی صلاحیتوں کے استعمال سے روکتی ہے اور اسے خلافت کے مقام تک پہنچنے کے لئے ہر ممکن طور سے مزاحمت کرتی ہے۔(۱۱۰)

مفسرین کا یہ گروہ گویا قصہ آدم و ابلیس کو ایک تمثیلی واقعہ مانتا ہے ،ان کے اس موقف کی تائید قرآن کے سیاق و سباق اور الفاظ وغیرہ سے بالکل نہیں ہوتی۔ اس کا اندازہ ہر اس شخص کو ہو سکتا ہے جو قرآن پر غور و فکر کا عادی ہو۔

مراجع و مآخذ

۱۔ استاذ مصطفیٰ عبدالرزاق، سوانح مصنف "دروس من القرآن الکریم" دارالہلال مصر (ب۔ت) ص ۲۰۔۲۱

۲۔ ڈاکٹر عثمان امین، رائد الفکر المصری الامام محمد عبدہ۔ مکتبۃ النہضۃ المصریۃ قاہرہ۔ ۱۹۵۵ء ص ۱۹

۳۔ احمد امین، زعماء الاصلاح فی العصر الحدیث ،مکتبۃ النہضۃ المصریۃ قاہرہ۔ ۱۹۶۵ء، ص ۲۸۲۔۲۸۳

۴۔ استاذ مصطفیٰ عبدالرزاق، سوانح مصنف "دروس من القرآن الکریم" ص ۲۵

۵۔ ڈاکٹر عثمان امین، رائد الفکر المصری۔ ص ۲۰

۶۔ استاذ مصطفیٰ عبدالرزاق، سوانح مصنف "دروس من القرآن الکریم" ص ۲۷

۷۔ احمد امین، زعماء الاصلاح فی العصر الحدیث۔ ص ۲۸۵۔۲۹۰

۸۔ ایضاً ص ۲۹۰۔۲۹۱

۹۔ استاذ مصطفیٰ عبدالرزاق، سوانح مصنف "دروس من القرآن الکریم" ص ۲۸۔۲۹

۱۰۔ ایضاً ص ۲۹۔۳۰

۱۱۔ عمر الدسوقی، فی الادب الحدیث، جلد اول، دار الفکر العربی طبع ہشتم، ۱۹۷۰ء ص ۲۸۳۔۲۸۵

۱۲۔ استاذ مصطفیٰ عبدالرزاق، سوانح مصنف "دروس من القرآن الکریم"، ص ۳۳

۱۳۔ عمر الدسوقی، فی الادب الحدیث ص ۲۸۵

۱۴۔ استاذ مصطفیٰ عبدالرزاق، سوانح مصنف "دروس من القرآن الکریم" ص ۳۴

۱۵۔ ڈاکٹر عثمان امین، رائد الفکر المصری، ص ۲۹

۱۶۔ عمر الدسوقی، فی الادب الحدیث، ص ۲۹۰۔۲۹۲

۱۷۔ رشید رضا، مقدمہ تفسیر المنار، جلد اول، دار المنار مصر، طبع چہارم، ۱۳۷۳ھ، ص ۱۱

۱۸۔ ڈاکٹر عثمان امین، رائد الفکر المصری، ص ۳۲۔۳۳

۱۹۔ احمد امین، زعماء الاصلاح فی العصر الحدیث، ص ۳۰۷۔۳۰۸

۲۰۔ عمر الدسوقی، فی الادب الحدیث، ص ۲۹۳۔۲۹۴

۲۱۔ شیخ مصطفیٰ عبدالرزاق، سوانح مصنف "دروس من القرآن الکریم" ص ۳۸

۲۲۔ احمد امین، زعماء الاصلاح فی العصر الحدیث، ص ۳۱۵

۲۳۔ عمر الدسوقی، فی الادب الحدیث، ص ۲۹۵۔۲۹۷

۲۴۔ شیخ مصطفیٰ عبدالرزاق، سوانح مصنف "دروس من القرآن الکریم" ص ۲۹

۲۵۔ عمر الدسوقی، فی الادب الحدیث، ص ۲۹۷

۲۶۔ ڈاکٹر عثمان امین، رائد الفکر المصری، ص ۳۷۔۳۸

۲۷۔ ایضاً ص ۳۹۔۴۰

۲۸۔ عمر الدسوقی، فی الادب الحدیث، ص ۳۰۱

۲۹۔ رشید رضا، مقدمہ تفسیر المنار جلد اول، دار المنار مصر طبع چہارم، ۱۳۷۳ھ، ص ۱۲۔۱۳

۳۰۔ ایضاً ص ۱۲

۳۱ محمد عبدہ تفسیر جزء عم، مطابع الشعب قاہرہ، طبع پنجم، ب ت

۳۲، ڈاکٹر محمد حسین الذہبی، التفسیر والمفسرون، جلد دوم، دار الکتب الحدیثہ (بدون مقام) طبع دوم، ۱۹۷۶ء، ص ۵۵۲۔

۳۳۔ محمد عبدہ، تفسیر سورہ العصر، مطبعۃ المنار، ۱۳۳۰ھ، ص ۴

۳۴۔ محمد عبدہ، دروس من القرآن الکریم، دار الہلال مصر، ب۔ت، مقدمہ ص ۷۔۱۹

۳۵۔ رشید رضا، مقدمہ تفسیر المنار، ج اول ص ۱۴

۳۶۔ ایضاً ص ۱۴

۳۷۔ ڈاکٹر محمد عثمان امین، رائد الفکر المصری، ص ۱۰۱

۳۸۔ رشید رضا، مقدمہ تفسیر المنار ص ۱۴۔۱۵

۳۹۔ ایضاً ص ۱۴۔

۴۰۔ احمد امین، زعماء الاصلاح فی العصر الحدیث ص ۳۲۹

۴۱۔ رشید رضا، مقدمہ تفسیر المنار، ص ۵۔۷

۴۲۔ ایضاً ص ۲۵۔۳۰

۴۳۔ ایضاً ص ۲۸۔۲۹

۴۴۔ ایضاً ص ۱۹۔۲۰

۴۵۔ ایضاً ص ۱۷

۴۶۔ ایضاً ص ۱۸۔۱۹

۴۷۔ ایضاً ص ۲۵۔۲۶

۴۸۔ ایضاً ص ۲۱۔۲۴

۴۹۔ ڈاکٹر محمد حسین الذہبی، التفسیر والمفسرون، ص ۶۸۴۔۶۸۷

۵۰۔ مقدمہ تفسیر المنار، ص ۲۱۔۲۲

۵۱۔ ڈاکٹر عثمان امین، رائد الفکر المصری، ص ۱۴۸۔۱۴۹

۵۲۔ محمد عبدہ تفسیر جزء عم، ص ۲۷

۵۳۔ مقدمہ تفسیر المنار، ص ۳۸

۵۴۔ محمد عبدہ، دروس من القرآن الکریم، ص ۴۸۔۵۲

۵۵۔ رشید رضا، تفسیر المنار، جلد اول ص ۱۰۵
۵۶۔ ڈاکٹر عثمان امین، رائد الفکر المصری، ص ۱۵۳۔۱۵۴
۵۷۔ محمد عبدہ، دروس من القرآن الکریم ص ۷۹۔۸۰
۵۸، ڈاکٹر عثمان امین، رائد الفکر المصری، ص ۱۴۹۔۱۵۰
۵۹۔ ایضاً ص ۱۵۰
۶۰۔ احمد امین، زعماء الاصلاح فی العصر الحدیث، ص ۳۲۷
۶۱۔ مقدمہ تفسیر المنار، ص ۲۷
۶۲۔ ڈاکٹر عثمان امین، رائد الفکر المصری، ص ۱۴۸
۶۳۔ مقدمہ تفسیر المنار، ص ۷۔۲۵
۶۴۔ ایضاً ص ۱۴
۶۵۔ ڈاکٹر محمد حسین الذہبی، التفسیر والمفسرون، ص ۵۵۸
۶۶۔ ڈاکٹر محمد بن لطفی الصباغ، لمحات فی علوم القرآن، المکتب الاسلامی، طبع سوم، ۱۹۹۰ء، ص ۳۱۴۔۳۱۵
۶۷۔ ڈاکٹر محمد حسین الذہبی، التفسیر والمفسرون، ص ۵۵۸۔۵۶۰
۶۸۔ ڈاکٹر عثمان امین، رائد الفکر المصری، ص ۱۵۳
۶۹۔ مقدمہ تفسیر المنار، ص ۷
۷۰۔ ایضاً ص ۷
۷۱۔ ایضاً ص ۱۹
۷۲۔ ڈاکٹر عثمان امین، رائد الفکر المصری، ص ۱۴۸
۷۳۔ مقدمہ تفسیر المنار ص، ۲۱۔۲۲
۷۴۔ ایضاً ص ۲۲
۷۵۔ ایضاً ص ۲۸
۷۶۔ ڈاکٹر عثمان امین، رائد الفکر المصری، ص ۱۵۴۔۱۵۵
۷۷۔ رشید رضا، تفسیر المنار، ج اول ص ۴۶۔۴۷
۷۸۔ ایضاً، ج دوم، دار المنار مصر، طبع سوم، ۱۳۶۷ھ، ص ۱۲۔۱۳

۷۹۔ رشید رضا، مقدمہ تفسیر المنار، ص

۸۰۔ ایضاص ۸۔۱۰

۸۱۔ تفسیر المنار، ج اول، ص ۳۲۴

۸۲۔ ایضاص ۳۲۵

۸۳۔ شیخ محمد عبدہ، تفسیر جزء عم۔ ص ۴۵۔۴۶۔ ایضاص ۶۱

۸۴۔ ڈاکٹر عثمان امین، رائد الفکر المصری، ص ۱۵۱

۸۵۔ شیخ محمد عبدہ، تفسیر جزء عم، ص ۱۸

۸۶۔ رشید رضا، تفسیر المنار، ج اول ص ۱۲۲۔۱۲۳

۸۷۔ ڈاکٹر عثمان امین، رائد الفکر المصری، ص ۱۵۰۔۱۵۱

۸۸۔ مقدمہ تفسیر المنار۔ ص ۷

۸۹۔ مثالوں کے لئے ملاحظہ ہو، ڈاکٹر عثمان امین کی کتاب، رائد الفکر المصری ص ۱۵۱۔۱۵۳۔ اور ڈاکٹر محمد حسین الذہبی کی کتاب، "التفسیر والمفسرون" ص ۶۰۔۶۲

۹۰۔ مقدمہ تفسیر المنار ص ۷۔۱۰

۹۱۔ ایضاص ۱۰

۹۲۔ شیخ محمد عبدہ، تفسیر جزء عم، ص ۱۲۵۔۱۲۷

۹۳۔ ایضاص ۱۳۸

۹۴۔ ایضاص ۱۳۹

۹۵۔ ڈاکٹر عثمان امین، رائد الفکر المصری، ص ۱۴۹

۹۶۔ احمد امین، زعماء الاصلاح فی العصر الحدیث، ص ۳۲۵

۹۷۔ ایضاص ۳۲۹۔

۹۸۔ مقدمہ تفسیر المنار، ص ۲۲۔۲۳

۹۹۔ ڈاکٹر عثمان امین، رائد الفکر المصری، ص ۱۶۱

۱۰۰۔ محمد عبدہ، تفسیر سورہ والعصر، مطبعہ المنار مصر، طبع دوم، ۱۳۳۰ھ، ص ۲۳۔۳۳

۱۰۱۔ محمد عبدہ، تفسیر جزء عم، ص ۲۹۔۳۰

۱۰۲۔ ایضاص ۱۲۳۔

۱۰۳ ڈاکٹر محمد بن لطفی الصباغ، لمحات فی علوم القرآن، ص۳۱۹

۱۰۴۔ ڈاکٹر عثمان امین، رائد الفکر المصری، ص۱۶۱

۱۰۵۔ احمد امین، زعماء الاصلاح فی العصر الحدیث، ص۳۳۰

۱۰۶۔ اس پر تبصرہ کے لئے ملاحظہ ہو، ڈاکٹر محمد حسین الذہبی کی کتاب "التفسیر والمفسرون" ص۵۶۷۔۵۷۲

۱۰۷۔ محمد عبدہ، تفسیر جزء عم، ص۳۹

۱۰۸۔ ایضاً ص۱۱۹۔۱۲۰

۱۰۹۔ سید رشید رضا، تفسیر المنار ، جلد اول، ص۱۷۶۔۱۷۷

۱۱۰۔ ایضاً ص ۲۶۷۔۲۷۰

ادارہ علوم القرآن کی تازہ پیش کش

صفحات ۳۲۰

قرآنی مقالات

قیمت عام ایڈیشن /۶۰

لائبریری ایڈیشن /۸۵

موقر رسالہ "الاصلاح" میں نصف صدی پیشتر شائع شدہ نایاب مقالات کا ایک نادر انتخاب

جس میں
* فلسفۂ نظم قرآن اور قرآن مجید کی ترجمانی کے اصول بتائے گئے ہیں۔
* بعض مشکل قرآنی آیات کی دل نشین تشریح کی گئی ہے۔
* بعض قرآنی مباحث پر اہم تحقیقاتی مضامین شامل ہیں۔
* اقسام القرآن کے سلسلہ میں افکار فراہی کی مدلل ترجمانی کی گئی ہے
* قرآنی تعلیمات، تقویٰ، خوف اور مومن کی مطلوبہ صفات بیان کی گئی ہیں۔

ادارہ علوم القرآن، پوسٹ بکس ۹۹، سر سید نگر، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲